فہرست

شذرات	تہذیب مشرق	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲:۲۳۶-۲۳۷)	جاوید احمد غامدی	۵
معارفِ نبوی	مسلمان، مومن، مجاہد اور مہاجر	زاویۂ فراہی	۷
دین و دانش	دین کا صحیح تصور	جاوید احمد غامدی	۱۱
حالات و وقائع	عروج و زوال کا قانون (۲)	ریحان احمد یوسفی	۲۵
	امریکہ کا کردار (۱)	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۳۷
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۳

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تہذیب مشرق

پیغمبر عربی کے پیرووں نے جب فارس و ہند کی سر زمین کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا تو اس خطۂ ارضی میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ لوگ وشنو و شیوا اور یزدان و اہرمن کی رزم گاہوں سے نکل کر وحدہ لاشریک کے مامن میں داخل ہوئے۔ ''وید'' اور ''گیتا'' متروک ہوئیں اور ''قرآن'' کتاب ہدایت کی حیثیت سے رائج ہوا۔ رام و کرشن اور رستم و سہراب کے بجائے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی ہیرو قرار پائے۔ ہم ساکنان عجم کی شایستگی اہل عرب کی صلابت سے، ہماری ندرت ان کی سادگی سے، ہماری کم آمیزی ان کی بے تکلفی سے، ہماری وضع داری ان کی راست بازی سے، اور ہماری دانش ان کی متانت سے ہم آہنگ ہوئی۔ عرب و عجم کی اس ہم آہنگی سے رسم و رواج بدلے، آداب معاشرت تبدیل ہوئے، لباس کی وضع قطع میں تبدیلی آئی، کھانے پینے اور رہنے بسنے کے انداز متغیر ہوئے، زبانوں میں ارتقا ہوا اور بالآخر فارس و ہند کی تہذیب ایک نئی تہذیب کی صورت میں صفحۂ ہستی پر نمایاں ہوئی۔ یہی تہذیب ہے جسے تہذیب مشرق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناں گوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بے زاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس تہذیب کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی بنا خاندان کے استحکام پر استوار ہے۔ اس میں رشتوں کا تقدس ہر حال میں قائم رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اسے پامال کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف خاندان، بلکہ معاشرہ اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیٹا بیٹی اور میاں بیوی کے بلاواسطہ رشتوں کے علاوہ دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، تایا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کے بالواسطہ رشتے بھی اپنے انفرادی تشخص کے ساتھ ظہور پزیر ہوتے اور خاندان کے افراد کو رشتوں کی ایک مضبوط لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ اس تہذیب میں بزرگوں کے احترام کو ایک عظیم قدر مانا جاتا ہے۔ اولاد جواں عمری میں بھی والدین کی تادیب وتنبیہ کو باعث افتخار سمجھتی ہے۔ گھر میں، بازار میں، محفل میں بزرگوں کا وجود باعث رحمت تصور کیا جاتا ہے اور ان کی خدمت کے لیے مسابقت کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس تہذیب میں شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے کی حیثیت سے مرد کو خاندان کی کفالت کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اس کی یہ ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ عورت بیوی، ماں، بہن اور بیٹی کی حیثیت سے گھریلو ذمہ داریاں پوری یک سوئی سے انجام دیتی رہے۔ چنانچہ اس بات کو پسند نہیں کیا جاتا کہ کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر خواتین معاشی جدوجہد کے لیے سرگرم ہوں۔ اس تہذیب میں عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر قرار پاتا ہے۔ اس کی تمام توانائی اس کے بچوں کی نشوونما اور اس کے خاندان کے استحکام پر صرف ہوتی ہے۔ وہ ماں، بہو اور بیوی کے روپ میں اپنا وجود خاندان کی بقا کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ ان حیثیتوں میں وہ ایثار و محبت کی لازوال داستانیں رقم کرتی ہے۔ اس تہذیب میں استاد اپنے طلبہ کو محض علوم وفنون سے فیض یاب نہیں کرتا، بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت کو اپنا مسئلہ بناتا ہے۔ وہ طلبہ کو اپنے بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ بے دھیانی پر خفگی کا اظہار کرتا ہے اور توجہ پر سراپا شفقت ہو جاتا ہے۔ طلبہ خودرو پودوں کی طرح آپ سے آپ پروان نہیں چڑھتے، بلکہ اپنی تراش خراش اور نشوونما کی ذمہ داری پورے اعتماد کے ساتھ اپنے استاد کے سپرد کرتے ہیں۔ پہلے وہ پوری یک سوئی کے ساتھ استاد کے رنگ میں رنگتے ہیں اور پھر اسی کے رنگ سے اپنا نیا رنگ نمایاں کرتے ہیں۔ اس تہذیب میں دن فجر سے طلوع ہوتا اور عشا پر مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان فطرت کے مقرر کردہ اوقات میں معمولات زندگی انجام دیتے ہیں۔ اس تہذیب میں لباس حیا اور عفت کو ملحوظ رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ یہ لباس محض تن ڈھانپنے کا سامان نہیں کرتا، بلکہ تہذیبی تشخص کی علامت قرار پاتا ہے۔ شلوار قمیص پہنے ہوئے مرد اور سر پر دوپٹا اوڑھے ہوئے خواتین اس تہذیب کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہیں۔ بول چال اور میل جول میں شایستگی اس تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔ تکریم، تکلف، رکھ رکھاؤ اور اپنائیت کے خاص اسالیب ہیں جو اس کی زبانوں میں نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس تہذیب میں کھانے پینے کے خاص آداب ہیں۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، مل جل کر کھانا، بڑوں کو پہلے پیش کرنا یہ سب آداب دسترخوان پر اس تہذیب کو اجاگر کرتے ہیں۔ اعزہ اور احباب کے لیے ایثار اور اخلاص کو اس تہذیب میں ایک لازمی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ تہذیب جو ایک ہزار سال تک مشرق کے افق پر سورج کی طرح روشن رہی، گزشتہ تین صدیوں سے روبہ زوال ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تہذیب مغرب کا استیلا لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ تہذیب اپنا تشخص کھوتی چلی جا رہی ہے۔ خاندان کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں، رشتوں میں فاصلے پیدا ہو رہے ہیں، بزرگوں کے احترام کی پہلی سی صورت باقی نہیں رہی، بچے عدم التفات کا شکار ہونے لگے ہیں، شلوار قمیص اور دوپٹا متروک ہوتے جا رہے، بول چال اور تعلقات میں شایستگی کا عنصر کم ہو رہا ہے، آپس میں بے گانگی کی فضا قائم ہونے لگی ہے، عفت اور حیا کے معاملے میں بے پروائی کا رویہ اختیار کیا جانے لگا ہے اور عربی، فارسی اور اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنایا جا رہا ہے۔ تہذیب مشرق کے زوال کی یہ صورتیں ہمارے شہروں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ زوال کا یہ سلسلہ جس سرعت سے جاری ہے اگر اس کی یہی رفتار قائم رہی تو وہ زمانہ دور نہیں جب ہماری یہ تہذیب خدانخواستہ ماضی کا افسانہ بن جائے گی۔

ہمارے ارباب دین و دانش مسلمانوں کی سیاسی ہزیمت پر نوحہ کناں ہیں، ان کے باہمی افتراق کے درد میں مبتلا ہیں، عامۃ الناس کی فقہ و قانون سے ناواقفیت پر رنجیدہ ہیں، دنیا پر غلبۂ دین کے لیے تڑپ رہے ہیں، مگر جس تہذیبی زوال پر انھیں خون کے آنسو رونا چاہیے، وہ اس سے بالکل بے خبر محسوس ہوتے ہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے یہ الفاظ شاید ان کی توجہ اس حادثے کی طرف مبذول کرا سکیں اور وہ ہماری تہذیب کو موت کے منہ میں جانے سے روک لیں:

> ''میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کی جنگ اگر تہذیب کے میدان میں ہار دی گئی تو پھر اسے عقائد و نظریات کے میدان میں جیتنا بھی بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس وجہ سے میں اپنے ان دوستوں کی خدمت میں جو اُردو اور شلوار قمیص اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر میرے اصرار کو دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں صرف فکر مغرب ہی کو نہیں، اس کی تہذیب کو بھی اپنے وجود کے لیے زہر ہلاہل سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں جس طرح اس کے فکری غلبہ کے خلاف نبرد آزما ہوں، اسی طرح اس کے تہذیبی استیلا سے بھی برسر جنگ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس معرکہ میں فتح کس کی ہوگی، لیکن یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ میں اسی طرح پوری قوت کے ساتھ اس سے لڑتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ میں نے جب اپنے زمانۂ طالب علمی میں پہلی مرتبہ ''ضرب کلیم'' کی لوح پر یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا کہ: ''اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف'' ـــــ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کی معنویت مجھ پر واضح نہیں ہوئی، لیکن اب میں جانتا ہوں کہ دور حاضر سے یہاں اقبال کی مراد کیا ہے، اور اس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ وہ اس زمانے کے چند باطل نظریات ہی کے خلاف نہیں، بلکہ پورے دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ میں اپنے دوستوں کی خدمت میں بھی یہی عرض کروں گا کہ ہو سکے تو وہ بھی خلوت میں کبھی ''ضرب کلیم'' پڑھیں۔ اس لیے کہ:
>
> فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں''

(مقامات ۹۱)

ـــــ منظور الحسن

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۵۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً، وَّ مَتِّعُوۡهُنَّ ، عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ، وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ، مَتَاعًا بِالۡمَعۡرُوۡفِ، حَقًّا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ . وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ، وَ قَدۡفَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ، فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّا اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ

اور اگر تم عورتوں کو اِس صورت میں طلاق دو کہ نہ اُنھیں ہاتھ لگایا ہو نہ اُن کا مہر مقرر کیا ہو تو مہر کے معاملے میں[۶۱۹] تم پر کچھ گناہ نہیں ہے، لیکن (یہ تو لازماً ہونا چاہیے کہ) دستور کے مطابق اُنھیں کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو، اچھی حالت والے اپنی حالت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ یہ حق ہے اُن پر جو احسان کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں[۶۲۰]۔ اور اگر تم نے طلاق تو اُنھیں ہاتھ لگانے سے پہلے دی، مگر مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا نصف اُنھیں دینا ہوگا، الّا یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا وہ چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے[۶۲۱]۔ اور یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے کہ تم مرد اپنا حق چھوڑ دو۔

[۶۱۹] 'لا جناح علیکم' کے ساتھ یہ الفاظ اصل میں عربیت کے اسلوب پر اس جملے میں حذف ہیں۔ ہم نے ترجمے میں انھیں کھول دیا ہے۔

[۶۲۰] یعنی ان عورتوں کو بھی سوسائٹی کے دستور اور اپنے معاشی حالات کے لحاظ سے کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو جن سے خلوت نہ ہوئی ہو یا جنھیں مہر مقرر کیے بغیر طلاق دے دی جائے۔

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ، وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ، وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. ﴿۲۳۶۔۲۳۷﴾

اور اپنے درمیان کی فضیلت نہ بھولو۔ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے اُس کو جو تم کر رہے ہو۔[۶۲۲] ۲۳۶۔۲۳۷

[۶۲۱] یعنی مہر مقرر رہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا، الّا یہ کہ عورت اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔ اس کے لیے اصل میں 'الا ان یعفون او یعفوا ' کے الفاظ مجانست کے اسلوب پر آئے ہیں اور 'الذی بیدہ عقدۃ النکاح ' کے الفاظ میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ طلاق کا اختیار شریعت نے مرد کو دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے۔ عورت کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری ہمیشہ سے مرد پر ہے اور اس کی اہلیت بھی قدرت نے اسے ہی دی ہے۔ قرآن نے اسی بنا پر اسے قوام قرار دیا اور اس سے پہلے اسی سورہ کی آیت ۲۲۸ میں بہ صراحت فرمایا ہے کہ 'للرجال علیھن درجۃ ' (شوہروں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔) چنانچہ ذمہ داری کی نوعیت اور حفظ مراتب، دونوں کا تقاضا ہے کہ طلاق کا اختیار شوہر ہی کو دیا جائے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت اگر علیحدگی چاہے تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔

[۶۲۲] استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے، لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو، بلکہ اس میدان ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے: ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے، اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے۔ دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے، وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے۔ تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے، یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیے۔ اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں، بلکہ اس کو دینے والا بنے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۴۸)

[باقی]

مسلمان، مومن، مجاہد اور مہاجر

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں اُن کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روی[1] انه قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: المسلم[2] من سلم المسلمون من لسانه ویده[3]. والمومن من امنه الناس علی دمائهم واموالهم[4]. والمجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه[5]. والمهاجر من هجر ما نهی اللّٰه عنه[6].

والذی نفسی بیده لا یدخل الجنة عبد لا یامن جاره بوائقه[7].

روایت ہوا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں[1]۔ اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے۔ اور مہاجر وہ ہے جس نے ہر اس چیز کو چھوڑ دیا جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس

کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو[۲]۔

ترجمے کے حواشی

زبان کے شر سے محفوظ رہنے سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کی دشنام طرازی، طعنہ زنی، بہتان تراشی اور چغل خوری سے محفوظ رہے۔

یہ بیان تعریف کا اسلوب نہیں ہے۔ یہاں وہ لازمی اثرات بیان ہوئے ہیں جو کسی شخص کے اسلام قبول کرنے، اپنے جذبۂ ایمان کو پروان چڑھانے اور جہاد اور ہجرت کی حقیقی روح اپنے اندر بیدار کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۱۱ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۱۰، ۱۱، ۶۱۱۹۔ مسلم، رقم ۴۰، ۴۱، ۴۲۔ ترمذی، رقم ۲۶۲۸، ۲۶۲۷، ۲۵۰۴۔ نسائی، رقم ۴۹۹۹، ۴۹۹۶، ۴۹۹۵۔ ابوداؤد، رقم ۲۴۸۱۔ احمد بن حنبل، رقم ۶۵۱۵، ۶۷۵۳، ۶۷۹۲، ۶۸۰۶، ۶۸۳۵، ۶۸۳۶، ۶۸۸۹، ۶۹۱۲، ۶۹۲۵، ۶۹۵۳، ۶۹۵۵، ۶۹۸۲، ۶۹۸۳، ۷۰۱۷، ۷۰۸۶، ۸۹۱۸، ۱۲۵۸۳، ۱۵۰۳۷، ۱۵۲۴۷، ۱۵۶۷۳، ۱۵۶۸۲، ۱۷۰۶۸، ۱۹۴۵۴، ۲۴۰۰۴، ۲۴۰۱۳۔ دارمی، رقم ۲۷۱۲، ۲۷۱۶۔ ابن حبان، رقم ۱۸۰، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۳۰، ۳۶۱، ۳۹۹، ۴۰۰، ۵۱۰، ۴۸۶۲۔ بیہقی، رقم ۲۰۵۴۴، ۲۰۵۴۵، ۲۰۹۲۸۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۸۷۰۱، ۱۱۷۲۶، ۱۱۷۲۷، ۱۱۷۳۰۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۹۵۱۹، ۲۶۴۹۶۔ عبدالرزاق، رقم ۸۸۱۷، ۲۰۲۹۷، ۲۰۸۵۲۔ ابویعلیٰ، رقم ۲۲۷۳، ۳۹۰۹، ۴۱۸۷، ۷۲۸۶، ۷۲۸۸، ۷۴۹۲۔ حمیدی، رقم ۵۹۵۔

۲۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۱ کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو اس وقت فرمائی جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ: 'ای الاسلام افضل؟' ''کون سا اسلام سب سے بہتر ہے؟'' جبکہ مسلم کی روایت، رقم ۴۰ کے مطابق آپ نے 'ای المسلمین خیر'۔ ''مسلمانوں میں سے بہتر کون ہے؟'' کے جواب میں یہ باتیں ارشاد فرمائیں۔ مزید براں ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: 'اسلم المسلمین اسلاما'۔ ''اسلام کو اس کی بہترین صورت میں اختیار کرنے والے مسلمان۔''

احمد بن حنبل کی بعض روایات مثلاً رقم ۲۴۰۰۴، ۲۴۰۱۳ کی رو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ خطبۂ حجۃ الوداع

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔

روایت کے حکم کی نوعیت ملحوظ رہے تو یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات مختلف موقعوں پر ارشاد فرمائی ہوگی تاکہ مسلمان دوسرے مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے اس ذمہ داری کے بارے میں متنبہ رہیں۔

۳۔بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۷۵۳ میں'المسلمون' (مسلمان) کی جگہ'الناس' (لوگ) کا لفظ آیا ہے۔جبکہ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۶۹۲۵ میں اس کے بجائے'المومنون' (مومنین) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

۴۔'والمومن من امنه الناس علی دمائهم و اموالهم' (اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو) کے الفاظ ترمذی، رقم ۲۶۲۷ سے لیے گئے ہیں۔

۵۔'والمجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه' (مجاہد وہ ہے جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے) کے الفاظ احمد بن حنبل، رقم ۲۴۰۰۴ سے لیے گئے ہیں۔

۶۔بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۱۱ اور مسلم، رقم ۴۱ میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:'المهاجر من هجر ما نهی اللّٰه عنه' (مہاجر وہ ہے جس نے ہر اس چیز کو چھوڑ دیا جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے) جبکہ بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۱۹۶ میں ان کی جگہ'المهاجر من هجر السیئات' (مہاجر وہ ہے جس نے برائیوں کو چھوڑ دیا) کے الفاظ آئے ہیں۔

۷۔متن کے آخر میں'والذی نفسی بیده ، لا یدخل الجنة عبد لا یامن جاره بوائقه' (اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کا ہم سایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو) کے الفاظ احمد بن حنبل، رقم ۱۲۵۸۳ سے لیے گئے ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین کا صحیح تصور

[یہ ''میزان'' کا ایک باب ہے۔نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض اہم ترامیم کی ہیں۔ یہ پورا باب ان ترامیم کے ساتھ ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دین کی حقیقت اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ اللہ کی ''عبادت'' ہے۔ عالم کا پروردگار اس دنیا میں اپنے بندوں سے اصلاً جو کچھ چاہتا ہے، وہ یہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (الذاریات ۵۱:۵۶)

''اور جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

قرآنِ مجید نے جگہ جگہ بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کر دینے کے لیے بھیجے تھے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ، وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ. (النحل ۱۶:۳۶)

''اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ اٹھایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

اس ''عبادت'' کے معنی کیا ہیں؟ یہ اگر غور کیجیے تو سورۂ نحل کی اسی آیت سے واضح ہیں۔ اللہ کی عبادت کے بالمقابل یہاں طاغوت سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ 'الطاغوت' اور 'الشیطان' قرآن میں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں، یعنی جو خدا کے سامنے سرکشی، تمرد اور استکبار اختیار کرے۔ اس کا ضد ظاہر ہے کہ عاجزی اور پستی ہی ہے۔ چنانچہ ''عبادت'' کے معنی ائمۂ لغت بالعموم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: 'اصل العبودیة الخضوع و التذلل'[1] (عبادت اصل میں عاجزی اور پستی ہے)۔ یہ چیز اگر خدا کی رحمت، قدرت، ربوبیت اور حکمت کے صحیح شعور کے ساتھ پیدا ہو تو اپنے آپ کو بے انتہا محبت اور بے انتہا خوف کے ساتھ اس کے سامنے آخری حد تک جھکا دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خشوع، خضوع، اخبات،

---

[1] لسان العرب ۹/۱۰۔

انابت، خشیت، تضرع، قنوت وغیرہ، یہ سب الفاظ قرآن میں اسی حقیقت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دراصل ایک داخلی کیفیت ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی اور اس کے نہاں خانۂ وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ ذکر، شکر، تقویٰ، اخلاص، توکل، تفویض اور تسلیم و رضا ـــــ یہ سب عبد و معبود کے مابین اس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اس تعلق میں اپنے پروردگار کی یاد سے اطمینان حاصل کرتا، اس کی عنایتوں پر اس کے لیے شکر کے جذبات کو اپنے اندر ایک سیلِ بے پناہ کی طرح امڈتے ہوئے دیکھتا، اس کی ناراضی سے ڈرتا، اسی کا ہو رہتا، اس کے بھروسے پر جیتا، اپنا ہر معاملہ اس کے سپرد اور اپنے پورے وجود کو اس کے حوالے کر دیتا اور زندگی میں ہر قدم پر اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ انسان کے ظاہری وجود میں اس تعلق کا ظہور جن صورتوں میں ہوتا ہے، ان کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا، خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ، وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ. تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ، یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا، وَّ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ. (السجدہ ۳۲: ۱۵۔۱۶)

’’ہماری آیتوں پر تو بس وہی ایمان لاتے ہیں جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب ان کے ذریعے سے انھیں یاددہانی کی جاتی ہے تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کو خوف و طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں بخشا ہے، اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔‘‘

یہ رکوع و سجود، تسبیح و تحمید، دعا و مناجات اور خدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کی راہ میں انفاق[۲] ـــــ یہی اصل ’’عبادت‘‘ ہے۔ لیکن انسان چونکہ اس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے اپنے اس ظہور سے آگے بڑھ کر یہ عبادت انسان کے اس عملی وجود سے متعلق ہوتی اور اس طرح پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس کا باطن جس ہستی کے سامنے جھکا ہوا ہے، اس کا ظاہر بھی اس کے سامنے جھک جائے۔ اس نے اپنے آپ کو اندرونی طور پر جس کے حوالے کر دیا ہے، اس کے خارج میں بھی اس کا حکم جاری ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کا کوئی پہلو اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہر لحاظ سے وہ اپنے پروردگار کا بندہ بن کر رہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (الحج ۲۲: ۷۷)

’’ایمان والو، رکوع کرو اور سجدہ کرو، اور اپنے پروردگار کے بندے بن کر رہو، اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

۲۔ اس کی ابتدا زمانۂ قدیم میں نذر اور قربانی سے ہوئی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے اس تعلق کے لیے یہ عبادت جب مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات متعین کرتی، مراسم طے کرتی اور دنیا میں اس تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حدود و قیود مقرر کرتی ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسے دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے بنی آدم پر واضح کی ہے، قرآن اسے ''الدین'' کہتا ہے اور اس کے بارے میں انھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ اسے بالکل درست اور اپنی زندگی میں پوری طرح برقرار رکھیں اور اس میں کوئی تفرقہ پیدا نہ کریں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ، وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ، وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ . (۴۲:۱۳)

''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا، اور جس کی وحی اب ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو فرمائی، اس تاکید کے ساتھ کہ (اپنی زندگی میں) اس دین کو قائم رکھو[3] اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔''

اس ''عبادت'' کے لیے جو مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات خدا کے اس دین میں بیان ہوئی ہیں، انھیں قرآن 'الحکمة' اور اس کے مراسم اور حدود و قیود کو 'الکتاب' سے تعبیر کرتا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ، وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ، وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا. (النساء۴:۱۱۳)

''اور اللہ نے تم پر ''الکتاب'' اور ''الحکمة'' نازل فرمائی اور اس طرح تمھیں وہ چیز سکھائی جس سے تم واقف نہ تھے، اور اللہ کی تم پر بڑی عنایت ہے۔''

وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ، وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ ، يَعِظُكُمْ بِهٖ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ . (البقرہ۲:۲۳۱)

''اور اپنے اوپر اللہ کی عنایت کو یاد رکھو اور اس ''الکتاب'' اور ''الحکمة'' کو یاد رکھو جو اس نے تم پر اتاری ہے، جس کی وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

اس ''الکتاب'' کو وہ ''شریعت'' بھی کہتا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ، فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(الجاثیہ۴۵:۱۸)

''پھر ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک واضح شریعت پر قائم کیا ہے۔ اس لیے تم اسی کی پیروی کرو اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو علم نہیں رکھتے۔''

---

[3] یعنی ہر حال میں اس پر قائم رہو۔ اقامت دین کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب ''برہان'' میں مضمون: ''تاویل کی غلطی''۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''الحکمۃ''ہمیشہ سے ایک ہی ہے،لیکن ''شریعت''انسانی تمدن میں ارتقااور تغیر کے باعث البتہ،بہت کچھ مختلف رہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً. (المائدہ۵:۴۸)	''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شرع و منہاج مقرر کیا ہے،اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

الہامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے۔زبور اِسی حکمت کی تمہید میں خداوند عالم کی تمجید کا مزمور ہے اور قرآن ان دونوں کے لیے ایک جامع شہ پارۂ ادب کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔بقرہ و نساء کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں،ان میں قرآن سے متعلق یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔تورات و انجیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ساتھ قیامت میں اپنا ایک مکالمہ نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ . (المائدہ۵:۱۱۰)	''اور جب میں نے تمھیں شریعت اور حکمت ،یعنی تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔''

''الحکمۃ''کی تعبیر جن مباحث کے لیے اختیار کی گئی ہے،وہ بنیادی طور پر دو ہیں:

ایک،ایمانیات۔

دوسرے،اخلاقیات۔

''الکتاب''کے تحت جو مباحث بیان ہوئے ہیں،وہ یہ ہیں:

۱۔قانونِ عبادات۔۲۔قانونِ معاشرت۔۳۔قانونِ سیاست۔۴۔قانونِ معیشت۔۵۔قانونِ دعوت۔۶۔قانونِ جہاد۔ ۷۔حدود و تعزیرات۔۸۔خورونوش۔۹۔رسوم و آداب۔۱۰۔قسم اور کفارۂ قسم۔

یہی سارا دین ہے۔خدا کے جو پیغمبر اس دین کو لے کر آئے ،انھیں ''نبی'' کہا جاتا ہے۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔''نبوت'' یہ ہے کہ بنی آدم میں سے کوئی شخص آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے۔قرآن اپنی اصطلاح میں اسے ''انذار''اور''بشارت'' سے تعبیر کرتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ . (البقرہ۲:۲۱۳)	''لوگ ایک ہی امت تھے۔(اُنھوں نے اختلاف کیا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔''

''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْلَتَعُوْدُنَّ فِي مِلَّتِنَا ، فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ، وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ . (ابراہیم ۱۴: ۱۳۔۱۴)

''اور ان کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمھیں اِس سرزمین سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں واپس آ ؤ گے۔ تب ان کے پروردگار نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو لازماً ہلاک کریں گے اور ان کے بعد تمھیں لازماً اس سرزمین میں بسائیں گے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ، اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ . كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ. (المجادلہ ۵۸: ۲۰۔۲۱)

''بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

رسالت کا یہی قانون ہے جس کے مطابق خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (الصّف ۶۱: ۹)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا کہ اسے وہ (سرزمین عرب کے) تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ یہ بات (عرب کے) اِن مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو۔''

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا انھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ حق ان کی ذات سے اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد کسی شخص کے پاس اس سے انحراف کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ''شہادت علی الناس'' ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو جن کے ذریعے سے قائم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ، شَاهِدًا عَلَيْكُمْ ،

''تمھاری طرف، (اے قریشِ مکہ)، ہم نے اسی طرح

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا. (المزمل ۷۳:۱۵)

ایک رسول بھیجا ہے، تم پر گواہ بنا کر، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔''

شہادت کا یہ منصب رسولوں کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی عطا ہوا۔ قرآن نے اسی بنا پر انھیں خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک جماعت 'امة وسطاً'[4] قرار دیا اور بتایا ہے کہ اس منصب کے لیے وہ اسی طرح منتخب کیے گئے جس طرح بنی آدم میں سے اللہ تعالیٰ بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، هُوَاجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ. هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (الحج ۲۲:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اِس جدوجہد کا حق ہے۔ اُسی نے تم کو (اِس ذمہ داری کے لیے) منتخب کیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کا طریقہ تمھارے لیے پسند فرمایا ہے۔ اُس نے تمھارا نام مسلمان رکھا تھا، اِس سے پہلے بھی اور اِس (آخری بعثت کے دور) میں بھی۔ اِس لیے (منتخب کیا ہے) کہ رسول تم پر گواہی دے اور دنیا کے باقی لوگوں پر تم (اِس دین کی) گواہی دینے والے بنو۔''

نبیوں اور رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بالعموم اپنی کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں، ان کے نزول کا مقصد قرآن مجید میں یہ بیان ہوا ہے کہ حق و باطل کے لیے یہ میزان قرار پائیں تاکہ ان کے ذریعے سے لوگ اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ ۲:۲۱۳)

''اور ان (نبیوں) کے ساتھ اپنی کتاب نازل کی، قولِ فیصل کے ساتھ تاکہ لوگ جن چیزوں میں اختلاف کر رہے تھے، ان کے درمیان یہ ان کے بارے میں فیصلہ کر دے۔''

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (الحدید ۵۷:۲۵)

''اور ان (رسولوں) کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب، یعنی (حق و باطل کے لیے) میزان نازل کی تاکہ (اس کے ذریعے سے) لوگ (حق کے معاملے میں) ٹھیک انصاف

---

[4] البقرہ ۲:۱۴۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پر قائم ہوں۔''

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا ہے۔ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وحی و الہام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور خدا کی عدالت زمین سے اٹھا لی گئی ہے[۵]۔ چنانچہ لوگوں کو دین پر قائم رکھنے کے لیے ''انذار'' کی ذمہ داری اب قیامت تک اس امت کے علما ادا کریں گے۔ علما کی یہ ذمہ داری سورۂ توبہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ، فَلَوْ لَا نَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ ، وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ، لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (۹:۱۲۲)

''اور سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ (اس کام کے لیے) نکل کھڑے ہوتے، لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے تا کہ دین میں تفقہ حاصل کرتے، اور اپنی قوم کے لوگوں کو انذار کرتے، جب (علم حاصل کر لینے کے بعد) ان کی طرف لوٹتے، اس لیے کہ وہ بچتے۔''

اس دین کا نام ''اسلام'' ہے اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ بنی آدم سے وہ اس کے سوا ہرگز کوئی دوسرا دین قبول نہ کرے گا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ... وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا ، فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ، وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (آل عمران ۳: ۱۹، ۸۵)

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ ... اور جس نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نامرادوں میں سے ہوگا۔''

''اسلام'' کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات اسی لفظِ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے اس ظاہر کے لحاظ سے یہ پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز قائم کی جائے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔

۵۔ بیت الحرام کا حج کیا جائے۔

۵؎ الاحزاب ۳۳: ۴۰۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآنِ مجید نے جگہ جگہ ان کی تاکید فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں یہ ایک ہی جگہ اس طرح بیان ہوئے ہیں:

الإسلام ، ان تشهد ان لا اله الا اللّٰه و ان محمداً رسول اللّٰه ، و تقيم الصلوٰة ، و تؤتی الزکوٰة ، وتصوم رمضان ، و تحج البيت. (مسلم،رقم۱)

''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت الحرام کا حج کرو۔''

دین کا باطن ''ایمان'' ہے۔ اس کی جو تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے یہ بھی پانچ ہی چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ نبیوں پر ایمان۔

۴۔ کتابوں پر ایمان۔

۵۔ روزِ جزا پر ایمان۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سورۂ بقرہ میں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، وَ قَالُوْا : سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا ، وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ. (۲:۲۸۵)

''رسول اس چیز پر ایمان لایا جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی اور اس کے ماننے والے بھی۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم اُس کے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے اور (اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت میں ہم سب کو) تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ـــــ تقدیر کے خیر و شر ـــــ کو ان میں شامل کر کے انھیں اس طرح بیان فرمایا ہے:

الايمان : ان تؤمن باللّٰه و ملٰئكته و كتبه ورسله واليوم الاٰخر ، و تؤمن بالقدر

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو مانو اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانو، اور آخرت کے دن

خیره و شره. (مسلم، رقم۱)

کو مانو، اور اپنے پروردگار کی طرف سے تقدیر کے خیر و شر کو بھی۔''

یہ ایمان جب اپنی حقیقت کے اعتبار سے دل میں اترتا اور اس سے اپنی تصدیق حاصل کر لیتا ہے تو اپنے وجود ہی سے دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے:

ایک عملِ صالح۔

دوسرے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

ارشاد فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ، وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر۱۰۳: ۱۔۳)

''زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی۔''

''عمل صالح'' سے مراد ہر وہ عمل ہے جو خدا کی اس حکمت کے موافق ہو جس پر اس عالم کی تخلیق ہوئی اور جس کے مطابق اب اس کی تدبیر امور کی جاتی ہے۔ اس کی تمام اساسات عقل و فطرت میں ثابت ہیں اور خدا کی شریعت اسی عمل کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' کے معنی اپنے ماحول میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کے ہیں۔ یہ حق کو ماننے کا بدیہی تقاضا ہے جسے قرآن نے ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' سے بھی تعبیر کیا ہے، یعنی وہ باتیں جو عقل و فطرت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو ان کی تلقین کی جائے اور جو منکر ہیں ان سے لوگوں کو روکا جائے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (التوبہ۹: ۷۱)

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کی نصیحت کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔''

ایمان کا یہ تقاضا ہر مسلمان کو نصح و خیر خواہی کے جذبے سے پورا کرنا چاہیے۔ دین کی صحیح روح کے ساتھ یہ ذمہ داری اس جذبے کے بغیر کسی حال میں پوری نہیں کی جا سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الدین النصیحة، للّٰه و لرسوله، و لائمة

''دین خیر خواہی ہے۔ اللہ کے لیے، اس کے رسول کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

المسلمین، و عامتھم. (بخاری، رقم ۵۶)

لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے، اور ان کے عوام کے لیے۔''

عام حالات میں ایمان کے تقاضے یہی ہیں، لیکن انسان کو اس کے خارج کے لحاظ سے جو حالتیں اس دنیا میں پیش آ سکتی ہیں، ان کی رعایت سے ان کے علاوہ تین اور تقاضے بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں:

ایک ہجرت،

دوسرے نصرت،

تیسرے قیام بالقسط۔

بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے؛ اسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ مسلمان کی حیثیت سے کھلا رہنا ہی اس کے لیے ممکن نہ رہے تو اس کا یہ ایمان اس سے تقاضا کرتا ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں یہ ''ہجرت'' ہے اور اپنے آپ کو اس طرح کی صورت حال میں دیکھ کر اس سے گریز کرنے والوں کو اس نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ، قَالُوْا : فِيْمَ كُنْتُمْ ؟ قَالُوْا: كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ .قَالُوْٓا: اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ، فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ، وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا. (۴:۹۷)

''جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں نکالیں گے کہ (دوسروں کے ڈر سے اپنے ایمان و اسلام کو چھپا کر) وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے تھے، ان سے وہ پوچھیں گے: یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے: ہم اس ملک میں مجبور اور بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔''

اسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آ جائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ دامے، درمے، سخنے دین کی مدد کی جائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے اولوالامر اگر اس مقصد کے لیے کسی وقت جہاد و قتال کا فیصلہ کریں تو ہر بندۂ مومن اپنی جان اور اپنا مال اس طرح ان کے حوالے کر دے کہ وہ جس محاذ پر اور جس طرح چاہیں اس سے کام لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ اللہ پروردگارِ عالم کی ''نصرت'' ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مدینہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت پیش آئی اور لوگوں سے جہاد و قتال کا مطالبہ کیا گیا تو قرآن نے ایک موقع پر اس کی دعوت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس طرح لوگوں کو دی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ، هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ؟ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا، نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ، وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ، كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ: مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ، قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ. (الصّف ۶۱: ۱۰۔۱۴)

''ایمان والو، کیا میں تمھیں وہ سودا بتاؤں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشے گا ؟ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ گے اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو گے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ (اس کے بدلے میں) اللہ تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ان باغوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ عمدہ گھر عطا فرمائے گا جو ابد کے نخل زاروں میں ہوں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے اور (سنو) وہ چیز بھی جس کی تم تمنا رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور وہ فتح جو عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اور اہل ایمان کو، (اے پیغمبر)، اس کی بشارت دو۔ ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو جس طرح کہ عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سلف وخلف میں دین کی حفاظت، بقا اور تجدید و احیا کے جتنے کام بھی ہوئے ہیں، ایمان کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ امت کی تاریخ میں زبان و قلم، تیغ و سناں اور درہم و دینار سے دین کے لیے ہر جدوجہد کا ماخذ یہی ''نصرت'' ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ایمان کا یہ تقاضا اگر کسی وقت سامنے آ جائے تو بندۂ مومن کو دنیا کی کوئی چیز بھی اس سے عزیز تر نہیں ہونی چاہیے۔ ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ ، وَ اَمْوَالُ ٰاقْتَرَفْتُمُوْهَا ، وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا ، وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ، وَاللّٰهُ لَايَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ.

''(اے پیغمبر)، ان سے کہہ دو کہ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان، اور تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا اور وہ تجارت جس کے مندے سے تم ڈرتے ہو، اور تمھارے وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اگر اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے اور

(التوبہ ۹:۲۴) (جان لو کہ) اس طرح کے بدعہدوں کو اللہ راہ یاب نہیں کرتا۔''

پھر اس عالم میں انسان کے جذبات، تعصّبات، مفادات اور خواہشیں اگر دین و دنیا کے کسی معاملے میں اسے انصاف کی راہ سے ہٹا دینا چاہیں تو یہی ایمان تقاضا کرتا ہے کہ بندۂ مومن نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر ان کا یہ مطالبہ پورا کرے۔ حق کہے، حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ انصاف کرے، انصاف کی شہادت دے اور اپنے عقیدہ و عمل میں حق و انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کرے۔ یہ ''قیام بالقسط'' ہے اور قرآنِ مجید میں اس کا حکم اس طرح بیان ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ، وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ، اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا، فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا، وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (النساء ۴:۱۳۵)

''ایمان والو، انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ اس کی زد خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے اقربا ہی پر پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے احق ہے۔ اس لیے تم خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر اسے بگاڑو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ. (المائدہ ۵:۸)

''ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔''

ایمان کا یہی تقاضا ہے جس کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے اس بات پر بیعت لیا کرتے تھے کہ: 'نقول بالحق اینما کنا، لانخاف فی اللّٰہ لومة لائم[۶]' (ہم جہاں ہوں گے، ہمیشہ حق کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پروا نہ کریں گے)۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر. (ابن ماجہ، رقم ۴۰۱۱)

''حق و انصاف کی بات ایک بڑا جہاد ہے، جب وہ ظالم حکمران کے سامنے کہی جائے۔''

اس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں ''تزکیہ'' ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی

۶؎ مسلم، رقم ۳۴۲۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے اس کے فکر و عمل کو صحیح سمت میں نشوونما دی جائے۔ قرآنِ مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں اور 'راضیة مرضیة' کی بادشاہی ہے اور فوز و فلاح کے اس مقام تک پہنچنے کی ضمانت انھی لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی. بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا، وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی. (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴۔۱۷)

''(اس وقت)، البتہ کامیاب ہوا وہ جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (نہیں)، بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دراں حالیکہ (آخرت اس کے مقابلے میں) بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔''

لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے اور سارا دین اسی مقصود کو پانے اور اسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ، وَ یُزَکِّیْهِمْ، وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ. (الجمعہ ۶۲: ۲)

''وہی ذات ہے جس نے ان امیوں میں ایک رسول انھی میں سے اٹھایا ہے جو ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور (اس کے لیے) انھیں شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اس دین پر عمل کے لیے جو رویہ اس کے ماننے والوں کو اختیار کرنا چاہیے، وہ ''احسان'' ہے۔ احسان کے معنی کسی کام کو اس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ دین میں جب کوئی عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کی روح اور قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اس کا ہر جز بہ تمام و کمال ملحوظ رہے اور اس کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے تو اسے ''احسان'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ، وَ هُوَ مُحْسِنٌ، وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا. (النساء ۴: ۱۲۵)

''اور اس سے بہتر دین کس شخص کا ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، اس طرح کہ وہ ''احسان'' اختیار کرے اور ملت ابراہیم کی پیروی کرے جو بالکل یک سو تھا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ اسلوب میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

الاحسان، ان تعبد اللّٰه کانك تراه، فان لم تکن تراه، فانه یراك. (مسلم، رقم ۱)

'''احسان'' یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۲)

عروج وزوال کے عمل میں مختلف گروہوں کی اہمیت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس بحث میں مختصراً ہم یہ بتائیں گے کہ معاشرے کی اجتماعی زندگی کے اجزاے ترکیبی کون سے ہوتے ہیں اور وہ کس طرح وجود پزیر ہوتے ہیں۔ نیز قومی زندگی میں ان کی اہمیت و مقام کیا ہے اور قوم کے عروج وزوال میں وہ کس طرح اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

قومی زندگی کے اجزاے ترکیبی

قومیں افراد کے مجموعے سے تشکیل پاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ افراد کو متنوع صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ پھر عملی زندگی میں ان کے سامنے مواقع بھی مختلف آتے ہیں۔ فرد کے اعتبار سے اس طریقۂ کار کا مقصد آزمایش ہے، مگر اجتماعی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یکساں صلاحیتوں اور مواقع ملنے والے افراد ایک گروہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگوں کو قیادت کی غیر معمولی صلاحیتیں اور مواقع ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوسائٹی کی فکری اور عملی قیادت انھی لوگوں میں سے آتی ہے۔ کچھ لوگوں کو مال و اقتدار کے حصول کے غیر معمولی مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قوم کی اشرافیہ (Elite) کی تشکیل کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو علوم وفنون کی طرف غیر معمولی رغبت ہوتی ہے۔ انھیں اپنے ذوق کی تسکین کے مواقع بھی میسر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ علم وفن کی دنیا آباد کرتے ہیں۔ کسی معاشرے کے افکار و رجحانات، عقائد وعبادات، خیالات و نظریات، رسوم ورواج، طرزِ معاشرت، غرض یہ کہ وہ تمام بنیادیں جو کسی سوسائٹی کا رخ متعین کرتی ہیں، ان لوگوں کے اثرات ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

تاہم سوسائٹی کی اکثریت وہ ہوتی ہے جن کا تعلق ان میں سے کسی گروہ سے نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں خدا نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نہیں نوازا ہوتا ہے، یا وہ لوگ جنھیں زندگی میں مواقع نہیں ملے ہوتے، یا وہ لوگ جنھیں مواقع اور صلاحیت میں سے کوئی چیز نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان لوگوں سے مل کر عوام الناس کا گروہ وجود میں آتا ہے۔ اور پھر مواقع اور صلاحیتوں میں فرق کے اعتبار سے خود ان لوگوں کے مختلف درجات بنتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ان کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ قوم کی رہنمائی نہیں کرتے، بلکہ مذکورہ بالا گروہ کی متعین کردہ راہوں پر چلتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح کسی قوم کی زندگی کے ابتدائی مراحل میں اس کے افراد قومی عصبیت کے اس جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں جو قوم کی تشکیل کا باعث ہوتی ہے۔ ایسے میں ہر فرد قوم کا قائم مقام ہوتا ہے اور اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر قومی تعمیر کے عمل میں حصہ لیتا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ عصبیت کا یہ جذبہ مدہم پڑتا جاتا ہے اور اس کا اظہار صرف غیر معمولی مواقع پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے قوم تہذیبی ارتقا کا سفر طے کرتی ہے، ضروری ہوتا چلا جاتا ہے کہ معاشرے کے نظام کو چلانے اور اس کے استحکام کے لیے ادارے وجود میں لائے جائیں۔ چنانچہ زمانۂ قدیم میں جب کسی قوم کی بقا و استحکام کا سب سے بنیادی ذریعہ فوج ہوا کرتی تھی تو ابتدائی دور کے گزرنے کے بعد سب سے پہلے فوج کو باقاعدہ ادارے کی شکل میں منظّم کیا جاتا تھا اور اسی کے سہارے ملک کو اندرونی و بیرونی خلفشار سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مختلف معاشروں کے حالات کے اعتبار سے اسی دوران میں سیاسی اور مذہبی قوتیں بھی اداروں کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ دیگر ادارے بھی وجود میں آنے لگے اور آج حال یہ ہو چکا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں معاشرے کا بڑا حصہ اب غیر فوجی اور غیر سیاسی اداروں کی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔

جب ہم ایک قوم کی بات کرتے ہیں تو مندرجہ بالا تمام عناصر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کی قوت قوم کی قوت ہوتی ہے اور ان کی کمزوری قوم کی کمزوری بن جاتی ہے۔ معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی و استحکام میں تمام عناصر کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔ جب تک وہ یہ کردار بھرپور طریقے سے ادا کرتے ہیں، اس وقت تک قوم بام عروج کی سیڑھیاں چڑھتی رہتی ہے اور جب یہ عناصر اپنے مطلوبہ کردار کو ادا کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو قومی زندگی کی گاڑی شاہراہِ ترقی سے اتر جاتی ہے اور زوال کی کھائی میں جا گرتی ہے۔

ذیل میں ہم ان میں سے ایک ایک گروہ کو لے کر قوم کے عروج و زوال میں اس کے کردار اور اہمیت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کریں گے۔

۱۔ قائدین

کسی قوم کے عروج و زوال کا بہت حد تک انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے اچھے قائدین میسر ہیں یا نہیں۔ قومی جسد میں قائدین کی حیثیت دماغ کی سی ہوتی ہے۔ انسانی جسم میں دماغ پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں جسم کے عمل یا ردعمل کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح قائدین قومی زندگی کے ہر مرحلے پر قوم کے اندر اور باہر سے اٹھنے والے ہر چیلنج کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جواب میں قوم کا ردعمل متعین کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عام حالات میں وہ قومی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھتے ہیں۔

قیادت کی بحث سمجھنے کے لیے ہم اس کی تین نمایاں اقسام پر بحث کرتے ہیں: فکری قیادت، مذہبی قیادت اور سیاسی قیادت۔

۱۔ فکری قیادت

انسان اصلاً ایک فکری مخلوق ہے۔ وہ اس دنیا میں جو کچھ بھی افعال سرانجام دیتا ہے، ان کی کوئی نہ کوئی فکری بنیاد ہوتی ہے۔ اعمال کے ترک و اختیار کا معاملہ ہو یا اشیا کے رد و قبول کا، اس کی اساس اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ وہ تمام اقدار، اصول، تصورات، نظریات، خیالات اور عقائد جن کے گرد وہ اپنی عملی زندگی کا تانا بانا بنتا ہے، ان کا تعلق فکر کی دنیا ہی سے ہوتا ہے۔ یہ بات اگر واضح ہے تو پھر اس حقیقت کو سمجھنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیے کہ وہ لوگ جو انسانی اذہان و افکار کی تشکیل کرتے ہیں، وہی لوگ سب سے زیادہ کسی معاشرہ اور قوم کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک قوم کی زندگی میں آنے والے ہر اہم موڑ میں ان لوگوں کی فکری رہنمائی کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہم اپنی بات کو کچھ مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کے خلاف ایک فکری محاذ قائم کیا۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی ہر خرابی سے پاک ایک تصوراتی دنیا کا نقشہ پیش کیا۔ اس طرح صنعتی انقلاب کے دھارے میں بہتے ہوئے معاشروں کے سامنے ایک نئی فکر آئی۔ اس کے نظریات نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ وہ خود تو اپنی زندگی میں اپنے نظریات کو عملی شکل میں نہ دیکھ سکا، مگر اس کے بعد روس میں اس کے افکار کے زیر اثر ایک عظیم اشترا کی انقلاب آیا جس نے آنے والی پون صدی تک نصف دنیا پر حکومت کی۔

اسی طرح علامہ اقبال نے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست کا تصور پیش کیا۔ انھیں بھی اپنی زندگی میں اپنی فکر کو عملی زندگی میں برگ و بار لاتے ہوئے دیکھنا نصیب نہ ہوا، لیکن ان کے بعد اس فکر کو مسلمانوں کی اکثریت نے قبول کیا جس کے نتیجے میں انگریزوں کے جانے کے بعد اس خطے میں دنیا کی پانچویں بڑی اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی ریاست وجود میں آئی۔

یہ دو مثالیں اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ کس طرح ایک فکری رہنما کی شخصیت اور اس کے نظریات کروڑوں، بلکہ اربوں لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تاہم ان مثالوں سے یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ ایک فکری رہنما صرف نظریہ دیتا ہے اور دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، بلکہ وہ معاشرے میں رائج قدیم تصورات کے خلاف جنگ بھی کرتا ہے اور نئے خیالات کو فروغ بھی دیتا ہے۔ وہ ان کی ذہنی تربیت بھی کرتا ہے اور ان کے شعور و فکر کے نئے دھارے بھی دیتا ہے۔ اس طرح وہ قوم کے معاملات کو مختلف انداز سے دیکھنے کی صلاحیت دیتا ہے اور اس کے قومی مزاج کی تشکیل نو کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں اور انگریزوں میں شدید مخاصمت پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں صدیوں سے قائم مسلمانوں کے اقتدار کو ڈھایا تھا۔ نیز جنگ آزادی میں فتح کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو بہت سختی کے ساتھ کچلا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے دل میں ان کے خلاف شدید نفرت تھی۔ ایسے میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو

www.javedahmadghamidi.com

انگریزوں سے ٹکراؤ کی پالیسی سے ہٹایا اور جدید تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ یہ انھی کی کوششیں تھیں جن کے زیر اثر مسلمانوں نے تعلیم اور سیاست کے میدان میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا اور آخر کار اپنے لیے ایک الگ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب رہے۔

اسی طرح یورپ میں مارٹن لوتھر اور کیلون (Calvin) وغیرہ نے سولھویں صدی کے آغاز پر اپنے افکار کے ذریعے سے یورپ کے معاشرے میں ہلچل مچا دی۔ انھوں نے چرچ کے اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی اور صدیوں سے جامد یورپی معاشرے کو آزادی کی نئی راہیں دکھائیں۔ یورپ کے عروج کی وجہ سائنس میں اس کی غیر معمولی ترقی تھی۔ چرچ اس سائنسی ترقی کا مخالف تھا۔ یہ لوتھر وغیرہ ہی تھے جن کے افکار کے زیر اثر چرچ کے اقتدار کو دھچکا پہنچا اور آزادی فکر کی فضا عام ہوئی۔ جس کے بعد یورپ نے تیزی سے عروج کا سفر طے کرنا شروع کر دیا۔

ب۔ مذہبی قیادت

انسان اس دنیا میں جن تصورات سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، وہ مذہبی تصورات ہیں۔ مذہب کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد انسان کے خارج میں نہیں، بلکہ انسان کے داخل میں ہے۔ کسی برتر ہستی کا تصور وہ داخلی بنیاد ہے جس سے انسان خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کر سکا۔ مذہب اپنی اساس میں ایسی ہی برتر ہستی یا ہستیوں کے تعارف کا نام ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان توجیہہ پسند واقع ہوا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں ان گنت سوالات ہیں جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ مذہب ان سولات کے سب سے آسان اور عام فہم جوابات دیتا ہے۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن کی بنا پر ہر دور میں مذہب اور اہل مذہب فرد و اجتماع کی زندگی میں بآسانی ایک غیر معمولی مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مذہب اصلاً ایک فکر اور ایک تصور ہے۔ چنانچہ تمام مذہبی قائدین بشمول انبیا علیہم السلام فکری قائدین ہوتے ہیں۔ لیکن مذہب صرف فکر تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور انسانوں کے طرزِ زندگی، رسوم و رواج، معمولات حتیٰ کہ سونے جاگنے کے اوقات اور دستر خوان کا بھی تعین کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں مذہب کی اس اہمیت کی بنا پر مذہبی قائدین اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا ذکر فکری قائدین سے علیحدہ کیا جائے۔

مذہبی قیادت کا فرد و معاشرے کی زندگیوں میں ہمیشہ ایک غیر معمولی کردار رہا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی مذہب میں چرچ اعتراف گناہ کے مذہبی تصور کے ذریعے سے فرد کے انتہائی ذاتی معاملات میں بھی مداخلت کا حق رکھتا تھا۔ یہ کوئی اختیاری معاملہ نہ تھا، بلکہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں چرچ نے لوگوں پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ سال میں ایک دفعہ ہر شخص اپنے علاقے کے پادری کے سامنے گناہوں کا اعتراف کرے گا۔ اسی طرح ۱۰۹۹ء سے لے کر ۱۲۹۱ء کے دوران میں لڑی جانے والی انسانی تاریخ کی مشہور اور اہم ترین لڑائیاں جو صلیبی جنگوں کے نام سے معروف ہیں، ایک مذہبی لیڈر پوپ اربن دوم نے شروع کرائیں۔ اس نے یورپ کے لوگوں میں جنگی جنون بھڑکایا اور انھیں مسلمانوں پر حملہ کر کے اپنے مقامات مقدسہ واپس لینے پر اکسایا۔

مذہبی قیادت قوموں کے عروج وزوال میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہے۔ اخلاقی اقدار کو فروغ دے کر یہ نہ صرف معاشرے میں استحکام پیدا کرتی ہے، بلکہ قومی زندگی کی مشکلات میں یہ سب سے بڑھ کر افراد کا حوصلہ بلند رکھتی ہے۔ اسی طرح قومی مفادات کے حصول کے لیے جس اجتماعی تحریک وتوانائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی مذہبی قیادت ہی فراہم کرتی ہے۔ اس اعتبار سے قوموں کی زندگی کے کٹھن لمحات میں مذہبی قیادت غیر معمولی کردار ادا کر کے قوم کو عروج کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف بعض اوقات مذہبی قیادت پوری قوم کو بے عملیت اور جمود کی طرف لے جاتی ہے، خود اخلاقی انارکی کا شکار ہو جاتی ہے اور بعض صورتوں میں یہ اہل اقتدار کی آلہ کار اور اپنے مفادات کی حریص ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں یہ قومی زوال کا اہم سبب بن جاتی ہے۔

دراصل مذہب ہر شخص کی ضرورت ہے۔ مذہبی رہنما لوگوں کی اس ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں اور لوگوں کی ضرورت بن جاتے ہیں۔ نیز مذہبی رہنما اپنی زندگیوں میں اعلیٰ اخلاقی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس کی بنا پر لوگوں میں ان کا غیر معمولی احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ افادیت اور احترام کا یہ مجموعہ جب مذہبی قائدین کی ذات میں جمع ہوتا ہے تو ان کے دائرۂ اثر کو معاشرے کے ہر فرد اور ہر گھر تک وسیع کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو فکر اور جو رویہ ان کی بارگاہ سے سند قبولیت حاصل کرتا ہے، وہی معاشرے کے عرف میں داخل ہو جاتا ہے اور جو ان کے ہاں مردود ٹھہرتا ہے، وہ عوام کی نگاہ سے بھی گر جاتا ہے۔

مذہبی قیادت جب تک زندہ ہوتی ہے، اپنے اس رسوخ کو استعمال کر کے معاشرے میں مثبت اقدار کو فروغ دیتی ہے اور شر کی طاقتوں کو اجتماعی زندگی میں دراندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح قومی زندگی کے استحکام میں ان کا کردار بڑا غیر معمولی ہوتا ہے۔ تاہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مذہبی قیادت میں زندگی مفقود ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں وہ ہر قدیم کو مقدس اور ہر جدید کو ملعون سمجھنے لگتی ہے۔ دوسری طرف زندگی کی گاڑی آگے کی سمت رواں رہتی ہے۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرہ آگے بڑھ جاتا ہے اور روایتی مذہبی قیادت جمود کا شکار ہو کر پیچھے رہ جاتی ہے۔ ایسے تبدیل شدہ حالات میں مذہبی قیادت بالعموم خود بدلنے کے بجائے اپنے اثر ورسوخ اور طاقت کی بنا پر نئے افکار کو دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دو میں سے ایک برا نتیجہ لازمی نکلتا ہے۔ ایک صورت میں انھیں کامیابی ہوتی ہے، مگر اس کے بعد قوم پس ماندگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ جیسے پوپ کے زیر اثر جنوبی یورپ کے ممالک اسپین، پرتگال اور اٹلی میں نئے افکار کو طاقت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ چنانچہ یہ ممالک جو پندرھویں صدی میں یورپ میں سب سے آگے تھے، آنے والے دنوں میں بقیہ یورپ سے پیچھے رہ گئے۔ اس کے برعکس لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک کے زیر اثر جس کا مرکز جرمنی تھا اور جو پوپ کے اثر سے باہر آچکا تھا، مغربی یورپ ترقی کی راہوں پر آگے بڑھتا چلا گیا۔

دوسری صورت میں مذہبی قیادت کو شکست ہو جاتی ہے اور جدید افکار اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ مگر اس کے نتیجے میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جدید افکار بعض ایسی بنیادی اقدار کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں جو مذہب کی زمین پر ہی جڑ پکڑتی ہیں۔ مثلاً یورپ میں آخر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کار چرچ کو شکست ہوئی۔ مگر اس کے بعد حیا اور عفت وغیرہ جیسی بنیادی انسانی اقدار کا خاتمہ ہو گیا اور بعض خبائث عام زندگی کا حصہ بن گئے۔ مثلاً سود اب مغربی معاشرے کا جز لاینفک ہے۔

ج۔ سیاسی قیادت

اس میں شک نہیں کہ فکری اور مذہبی قیادت قومی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، مگر وہ قوموں کی زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عملی زندگی کے تقاضے فکری اور مذہبی معاملات سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے بالعموم فکری اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار نہیں آتا۔ چنانچہ یہ سیاسی قائدین ہوتے ہیں جو قوموں کی زندگی کے نازک ترین فیصلے کرتے ہیں اور اس فضا کو استعمال کرتے ہیں جو مذہبی اور فکری قائدین بنا چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اقبال کے خواب کو تعبیر محمد علی جناح نے دی اور مارکس کے نظریات لینن کی قیادت میں عملی شکل اختیار کر سکے۔

دراصل حکومت و ریاست قومی زندگی کا سب سے اہم شعبہ ہے اور اس پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی قائدین جو اقتدار کی سطح پر قومی معاملات میں دخیل ہوتے ہیں، ان کی اہمیت غیر معمولی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ان کے فیصلے تاریخ ساز ہو جاتے ہیں۔ جس روز جنرل ضیاء الحق نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ روس کو واپس دریائے آمو کے پار بھیج کر ہی دم لیں گے، اس وقت کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک شخص کا یہ عزم انسانی تاریخ کے کیسے عظیم موڑ کا پیش خیمہ ثابت ہو گا مگر اس فیصلے نے ایک سپر پاور کا خاتمہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود پاکستانی قوم کو اس فیصلے کی بہت بھاری قیمت دینی پڑی۔

فکری اور مذہبی قیادت کے برخلاف سیاسی قائدین قوم کے اجتماعی مزاج کی تشکیل میں براہِ راست حصہ نہیں لیتے۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جیسی کچھ قوم انھیں ملی ہے، وہ اس کی امنگوں پر پورا اترے۔ جو مواقع ہیں، انھیں استعمال کریں اور جو مسائل ہیں، ان سے قوم کو نجات دلائیں۔ سیاسی قائد کا اصل کردار قوم کو متحرک کرنا ہے۔ وہ قوم میں ایک جذبہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے، اس کا حوصلہ بلند کرتا ہے اور اسے نئی راہیں دکھاتا ہے۔ خود ایک سیاسی قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ حوصلہ مند اور مستقل مزاج ہو۔ اس میں اپنے مقصد کے حصول کی غیر معمولی لگن ہو۔ اور اس راہ میں وہ کسی مشکل کو بھی خاطر میں نہ لاتا ہو۔ ان خصوصیات کے ہونے پر قائد پوری قوم متحد بھی کر لیتا ہے اور ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے۔ تاہم اگر یہ خصوصیات نہ ہوں تو پوری قوم کے اس کے پیچھے کھڑے ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قائد خود بھی ڈوبتا ہے اور پوری قوم کی نیا بھی ڈبو دیتا ہے۔ گویا سیاسی قیادت قوم کے عروج و زوال کے پیچھے کارفرما سب سے زیادہ موثر عامل کا کام کرتی ہے۔ ہم تاریخ کی دو مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کریں گے۔

۱۳۴ھ میں خلافت بنو امیہ کے خاتمہ کے وقت عباسیوں نے بنو امیہ پر ظلم و ستم کے ایسے پہاڑ توڑے کہ جن کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ زندوں کے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا انھوں نے اموی خلفا کی قبریں بھی کھود ڈالیں۔ ہشام بن عبدالملک کی قبر سے اس کی لاش صحیح سالم نکل آئی تو اسے کوڑے لگائے گئے، پھر صلیب پر چڑھایا گیا اور آخر میں لاش کو جلا کر راکھ بنا دیا گیا۔ اموی خاندان سے تعلق رکھنے والوں اور ان کے ہمدردوں کو چن چن کر بے رحمی سے ہلاک کیا گیا۔ ان حالات میں

عبدالرحمٰن بن معاویہ نامی ایک اموی شہزادہ شام سے اپنی جان بچا کر بھاگا اور بچتا بچاتا افریقہ جا پہنچا۔ کئی سال تک اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھرا۔ آخر کار اس نے اندلس کا رخ کیا جہاں عباسیوں کے اثرات ابھی تک قائم نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت اندلس میں خانہ جنگی کی کیفیت تھی۔ اس غریب الوطن نوجوان شہزادہ نے، جس کے خاندان کا اقتدار تباہ ہو چکا تھا اور دنیا کی طاقت ور ترین حکومت اس کی جان کے درپے تھی، اپنی ہمت وحوصلہ اور جرأت واستقامت کے بل بوتا پر اندلس میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد اگلی تین دہائیوں تک وہ مسلسل ان مسائل سے نمٹتا رہا جو عباسیوں، یورپ کے عیسائیوں اور سب سے بڑھ کر اندرونی بغاوتوں نے اس کے لیے پیدا کیے۔ اس نے اپنی غیر معمولی خوبیوں کی بنا پر ان تمام مشکلات پر قابو پا کر اندلس میں اعلیٰ درجے کا نظم ونسق قائم کیا اور عباسیوں کے تسلط سے آزاد امویوں کی حکومت قائم کی جس نے اگلی تین صدیوں تک انتہائی شان وشوکت سے اندلس پر حکمرانی کی۔ اس طرح اس عظیم لیڈر کے عزم وحوصلہ سے مسلم اسپین کے عروج کی وہ شان دار تاریخ وجود میں آئی جس پر مسلمان آج تک فخر کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف ۱۸۵۷ء میں ہندستان کے باشندوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک زبردست بغاوت کر دی۔ اپنے وطن سے دور اور تعداد میں بہت کم انگریزی فوج کو شکست دینا بہت مشکل نہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے جو مغل حکمران فطری طور پر اس جنگ کا قائد بن سکتا تھا، وہ ایک بوڑھا اور کمزور شاعر تھا۔ مغلیہ شہزادوں میں کوئی ایسا جواں مرد نہ تھا جو قیادت کے اس خلا کو پورا کر سکے۔ چنانچہ سیاسی قیادت کی اس کمزوری کی بنا پر اس عظیم موقع کو جو حالات نے پیدا کر دیا تھا، استعمال نہ کیا جا سکا۔ مزید یہ کہ اس کی بنا پر برصغیر میں مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا اور مسلمانانِ ہند کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۔ اشرافیہ (Elite)

قائدین کی مذکورہ بالا بحث میں ہم نے یہ دیکھا کہ وہ قومی زندگی میں کتنا غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر تاریخ میں قائدین کا تذکرہ نمایاں الفاظ میں درج ہوتا ہے۔ تاہم وہ تنہا قومی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے، جب تک کہ قوم کی اشرافیہ ان کا ساتھ نہ دے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر حالات میں اشرافیہ ہی سے کسی قوم کی قیادت جنم لیتی ہے۔ یہی ایک بات قومی زندگی میں اشرافیہ کی اہمیت کی عکاس ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس بحث کے شروع میں بیان کیا تھا کہ اشرافیہ کا گروہ وہ لوگ تشکیل دیتے ہیں جنھیں مال واقتدار کے حصول کے مواقع اور صلاحیتیں خدا نے عام لوگوں سے زیادہ دی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اکثر ان لوگوں کے لیے معاش کی وہ جدوجہد جو دوسروں کی آخری توانائیاں تک نچوڑ لیتی ہے، بہت بڑا مسئلہ نہیں بن پاتی۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے اور ذاتی مشکلات سے محفوظ لوگ ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اجتماعی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ ان کے پاس نہ صرف اس کام کے لیے درکار وقت اور پیسا وافر مقدار میں ہوتا ہے، بلکہ یہ ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح وہ حکومت اور حکمرانوں سے قریب رہتے ہیں اور اقتدار کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں اشرافیہ نواب، امرا، روسا، جاگیردار، فوجی سردار اور سیاسی اثر ونفوذ رکھنے والے خاندانوں کی صورت میں موجود تھی۔ عصر حاضر میں ان پرانی شکلوں کے علاوہ یہ لوگ صنعتی اور تجارتی اداروں کے مالکان، انھیں چلانے والے باصلاحیت افراد اور دیگر منفعت بخش پیشوں سے وابستہ لوگوں کے روپ میں معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ اپنی تعداد کے اعتبار سے معاشرہ کا ایک بہت قلیل حصہ ہوتے ہیں، لیکن اجتماعی وسائل کے بیشتر حصہ پر ان کا قبضہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایک طرف تو حکمران اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کا تعاون حاصل کریں، دوسری طرف عوام الناس پر بھی ان کا گہرا اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنی نانِ شبینہ کے لیے وہ زیادہ تر ان کے قائم کردہ اداروں ہی کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم دور حاضر میں جمہوریت، انسانی حقوق اور مساوات کے نعروں اور آزادی فکر، میڈیا اور تعلیم کے فروغ کی بنا پر عوام الناس کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی ہے۔ اس بنا پر وسائل واقتدار پر قابض اشرافیہ کو اب قومی زندگی میں وہ فیصلہ کن قوت حاصل نہیں رہی جیسا کہ ماضی میں انھیں حاصل تھی۔ بلکہ وہ دیگر گروہ جو عوام الناس کو متاثر کرنے کی اہلیت یا مواقع رکھتے ہیں، وہ بھی بہت طاقت ور ہو گئے ہیں اور اپنی اسی طاقت کی بنا پر اشرافیہ میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان میں اہل قلم، پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے وابستہ افراد اور دیگر علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے وہ ممتاز افراد شامل ہیں جن کو عوام میں پزیرائی حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں دورِ حاضر میں اشرافیہ ایک ایسے باصلاحیت گروہ کا نام ہے جسے قدرت نے وسائل، اقتدار اور عوام میں نفوذ کے غیر معمولی مواقع اور صلاحیتیں عطا کی ہوتی ہیں۔ معاشرے کے وہ تمام باصلاحیت لوگ جنھیں مواقع ملتے چلے جائیں، اشرافیہ کے اس گروہ میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم اشرافیہ کی ہیئت ترکیبی میں فرق پڑنے سے اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑا کہ آج بھی کسی قوم کی قیادت اور سیادت مجموعی طور پر انھی کے پاس ہوتی ہے۔ عوام الناس آج بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ انھی سے متاثر ہوتے ہیں۔ معاشرے کے اجتماعی خیر وشر اور قوم کے عروج وزوال میں ان لوگوں کا کردار آج بھی غیر معمولی ہے۔

قرآن قوموں کے عروج وزوال میں اشرافیہ کی اہمیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''اور جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فساد شروع کر دیتے ہیں۔ پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور انہیں برباد کر ڈالتے ہیں۔'' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۶)

یہ لوگ معاشرے کے جسد میں اعضاے رئیسہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ فساد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تو قومی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب تک یہ لوگ مجموعی طور پر خیر وصلاح کی طرف مائل رہتے ہیں، قومی معاملات درست رہتے ہیں۔ خاص طور پر قوم کو جب چیلنج پیش آ جائے تو یہی لوگ سب سے پہلے اس کا ادراک کر کے اس کی ٹھیک حیثیت متعین کرتے ہیں۔ پھر انھی میں سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو چیلنج کا جواب دینے کے لیے اٹھتے ہیں۔ اشرافیہ ہی میں ہی سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان قائدین کا دامے، درمے، قدمے، سخنے ساتھ دیتے ہیں۔ تاہم جب یہ گروہ چیلنج کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جواب دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے تو قوم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور آخر کار قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

۳۔عوام الناس

عوام الناس کے بارے میں بالعموم دو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ یہ بے چارے معصوم و بے قصور لوگ ہوتے ہیں جنھیں بادشاہوں کی بداعمالیوں کی سزا ملتی ہے۔ یہ حقیقت کی درست ترجمانی نہیں ہے۔ عوام الناس قومی جسد کا اکثریتی حصہ ہوتے ہیں اور انھی کا اجتماعی رویہ قومی کردار کو متعین کرتا ہے۔ قوم کے عروج و زوال میں ان کے اخلاقی رویے کا ہمیشہ ایک کردار رہا ہے۔ زوال کا عمل گو اشرافیہ کے اخلاقی انحطاط سے شروع ہوتا ہے، مگر یہ پایۂ تکمیل اسی وقت پہنچتا ہے جب عوام عقل، فطرت اور مذہب کی تمام رکاوٹیں پھلانگ کر اندھا دھند ان کی پیروی شروع کر دیں یا پھر اجتماعی خیر و شر سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات میں مگن ہو جائیں۔ مورخین نے بغداد کی تباہی سے قبل وہاں کے عوام الناس کی بے حسی، اخلاقی پستی اور مذہبی تفرقہ بازی کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ ہماری بات کی تصدیق کرتا ہے۔ رومن قوم میں دورِ زوال میں توہم پرستی اور بدکاری، دونوں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے دور زوال میں مزدک نامی تحریک وجود میں آئی جس میں دولت اور عورت کو مشترکہ قرار دے دیا گیا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں قباد بن فیروز نے اس تحریک کی سرپرستی کی جس کے بعد پوری قوم عیش پرستی میں مخمور ہو گئی۔

اسی طرح یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دور حاضر سے قبل عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے اس گلے کی سی ہوتی تھی جس کی قسمت کا تمام تر انحصار اپنے گلہ بان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ جنھیں اپنی زندگی کے کسی فیصلہ کا کوئی اختیار نہیں ہوتا تھا۔ اکثر حالات میں ان کی حیثیت حوصلہ مند قائدین اور مقتدر طبقات کے درمیان برپا رہنے والے معرکوں کے تماشائی کی سی ہوتی تھی۔ عوام کالانعام اور الناس علی دین ملوکہم جیسے محاورے قدیم معاشرے میں ان کی فکری اور عملی مقام کو بہت اچھے طریقے پر واضح کرتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے، لیکن یہ کلی حقیقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام الناس کی زندگیوں کے فیصلے اگر حکمران کرتے رہے ہیں تو بہر حال انھیں بھی ان کی قومی امنگوں، خواہشات اور جذبات کا احترام کرنا پڑا ہے۔ یہ تاریخ کے بعض ادوار میں اگر حالات کے اسیر محض رہے ہیں تو بعض مقامات پر بہر حال ان کی رضا و خوش نودی کے لیے مقتدر طبقات کو بھی اپنے طرزِ عمل کو متعین کرنا پڑا ہے۔ سلطنت روم میں عیسائیت کے فروغ کے بعد قسطنطینہ کا قبول عیسائیت اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح عوام کے جذبات مجروح کر کے طاقت کے زور پر ان پر حکومت کرنا ممکن تھا، لیکن اس کا طویل عرصے تک برقرار رہنا ممکن نہ تھا۔ مثال کے طور پر بنوامیہ کا طرز عمل کئی اعتبار سے عام مسلمانوں کے جذبات کے منافی تھا۔ چنانچہ بنوعباس نے اس بے چینی کا فائدہ اٹھایا اور ایک موثر تحریک چلا کر اس وقت بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، جب ان میں مزید کئی صدیوں تک اقتدار میں رہنے کی سکت باقی تھی۔ جیسا کہ اندلس میں اگلی تین صدیوں تک انھوں نے اپنا اقتدار قائم رکھا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ دورِ جدید میں عوام الناس کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ بالخصوص جمہوریت

کے فروغ کے بعد عوامی امنگوں کے خلاف اقتدار میں رہنا عملاً ناممکن ہو چکا ہے۔ سیاسی نمائندے، جن کے ہاتھوں میں قوم کی تقدیر ہوتی ہے، عوامی تائید کے بعد ہی اقتدار میں آتے ہیں۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ اب حکمران جور وستم کے بجائے پروپیگنڈے کے سحر سے لوگوں کو اپنا اسیر بناتے ہیں اور عوام آج بھی اپنی ذہنی کمزوری کی بنا پر مقتدر طبقات کے اشارۂ ابرو پر جیتے ہیں۔ پہلے یہ ان کی تلوار کے خوف سے ہوتا تھا اور اب میڈیا کی زنجیریں عوام کے فکر و عمل کو جکڑ لیتی ہیں۔ تاہم یہ صورت حال تعلیم اور شعور کے فروغ کے ساتھ مشروط ہے۔ جہاں عوام تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتے ہیں، وہاں وہ اپنے فیصلے خود آزادانہ طور پر کرتے ہیں۔ اور جہاں تعلیم اور شعور ناپید ہیں، وہاں پہلے اگر انھیں آزادانہ فیصلے کا اختیار نہ تھا تو اب ان میں آزادانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۴۔ ادارے

اداروں کے ضمن میں کچھ بحث ہم اوپر کر چکے ہیں جہاں ہم نے یہ بتایا تھا کہ ادارے معاشرے کے نظام کو چلانے اور اس کے استحکام کے لیے وجود میں لائے جاتے ہیں۔ کوئی قوم جیسے جیسے تہذیب وتمدن کا سفر طے کرتی ہے، زندگی کے مختلف شعبوں کو ہموار طریقے سے چلانے کا عمل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے جو ذمہ داری ایک یا چند افراد مل کر غیر منظم طریقے سے ادا کر دیا کرتے تھے، اس کی ادائیگی کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ ایک پورا ادارہ قائم کرنا، اس کے حدود وقیود اور اصول وضوابط مرتب کرنا اور اس کا ایک تنظیمی ڈھانچا ترتیب دینا ایک ناگزیر تمدنی ضرورت بن جاتا ہے۔

ادارے چونکہ اجتماعی مفاد کے اصول پر چلتے ہیں، اس لیے ان کا استحکام ہمیشہ معاشرتی استحکام کا باعث ہوا کرتا ہے۔ یہ جتنے طاقت ور ہوتے ہیں معاشرہ اسی رفتار سے ترقی کا سفر طے کرتا ہے۔ ادارے ان قومی روایات کے امین ہوتے ہیں جو اجتماعی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی طالع آزما ان روایات کو توڑتا ہے اور اداروں کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اداروں کے زوال کا باعث ہوتی ہے، بلکہ آخر کار قومی زوال کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قومی طاقت اب ان اداروں میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ اور ان کی تباہی قومی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

اداروں کی مزید اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ ادارہ ہی وہ جگہ ہے جہاں قوم کے افراد اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ یہی ادارے افراد کو وہ اسباب و وسائل مہیا کرتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب تک کسی قوم کے اداروں میں اصول اور میرٹ کا رواج رہتا ہے، باصلاحیت افراد آگے آتے رہتے ہیں اور جب قابلیت کے بجائے سفارش، رشوت اور تعلقات کی بنیاد پر معاملات چلنے لگتے ہیں تو اول ادارے اور پھر پوری قوم بنجر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

آج مغرب نے جو ترقی کی ہے، اس میں بنیادی کردار اس حقیقت کا ہے کہ وہاں ادارے شخصیات پر مقدم ہو چکے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں چند سالہ شخصی اقتدار کے لیے بارہا اداروں کو ذبح کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ادارے قومی زندگی کی تعمیر

www.javedahmadghamidi.org

تو کیا کرتے اپنی زندگی و بقا کے لیے بھی صاحبان اقتدار کے محتاج ہیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ادارے خود کچھ نہیں ہوتے، بلکہ قوم کے اجتماعی شعور کے عکاس ہوتے ہیں۔ جب اداروں کا وقار مجروح ہو رہا ہو اور قوم خاموش ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم بے شعوری کے آخری مقام پر کھڑی ہے۔ یہ اصلاً قوم کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اداروں کو تحفظ دے۔ اس کے بعد وہ وقت آتا ہے کہ پھر ادارے قوم کو تحفظ دینا شروع ہو جاتے ہیں۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر محمد فاروق خان

امریکہ کا کردار

امت مسلمہ اور پاکستان کے تناظر میں

(۱)

موضوع کی ضرورت و اہمیت

امت مسلمہ اور پاکستان کے تناظر میں ریاست ہاے متحدہ امریکہ کا مطالعہ ہمارے لیے حد درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وسیع و عریض ملک، جس میں بیک وقت چار مختلف ٹائم زون ہیں، آج دنیا کا سب سے ترقی یافتہ، دولت مند اور طاقت ور ملک ہے۔ یہ حیثیت اسے کئی دہائیوں سے حاصل ہے۔ تاہم سوویت روس کے حصے بخرے ہونے کے بعد تو اس کا کوئی ظاہری حریف بھی نہیں رہا۔ دنیا کے چھ بڑے ممالک یعنی برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، روس اور چین کی مجموعی طاقت بھی اس سے کم ہے۔ دنیا بھر کی تجارت میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ صنعت و حرفت میں یہ سب سے آگے ہے۔ اسلحہ سازی میں کوئی دوسرا ملک اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ دنیا بھر کے ہر معاملے میں وہ سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لیتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اندر اس کا موقف سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے، چنانچہ ہم ہی پر کیا موقوف، ہر ملک کے لیے امریکہ سے تعلق اہم ترین ایشوز میں سے ایک بن گیا ہے۔

امریکی موقف، اقدام اور کردار کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے اور اس کے مطابق اپنی حکمت عملی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں امریکہ سے بھرپور واقفیت ہو۔ اس کی تاریخ، اس کے جمہوری نظام، اس کی اقدار، اس کے کلچر، اس کے طرز زندگی، اس کے اداروں اور اس کی سوچ کے مختلف زاویوں پر ہماری پوری گرفت ہو۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم کوئی حکمت عملی بنائیں گے تو وہ ہمارے مفادات اور امن عالم کے لیے بہتر ہو گی۔

اس وقت عالم اسلام میں امریکہ کے متعلق تین رویے ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ مجموعۂ شر اور شیطان کبیر ہے۔ وہ مسلمانوں کا دشمن ہے اور انھیں نیست و نابود کرنا چاہتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی طور پر ہمیشہ کمزور، دست نگر اور اپنی گرفت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہر حال میں مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی کا مخالف ہے اور اس مقصد کے لیے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ

مسلسل مصروف عمل ہے۔ مسلمانوں کی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کی جڑ امریکہ ہے۔ پاکستان میں اور مسلم دنیا کے کسی ملک میں امریکہ کے اشارۂ ابرو کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ہر حکمران کا نصب وعزل امریکہ ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر دو مسلمان گروہ یا ملک آپس میں لڑتے ہیں تو یہ بھی دراصل امریکی سازش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے امریکہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ لازماً خلاف اسلام اور خلاف مسلم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر امریکی اقدام کی مخالفت کریں۔ امریکہ کے خلاف مسلمان رائے عامہ کو بیدار کریں اور بیدار رکھیں۔ ہماری سیاست اور ہماری سوچ کا مرکز ومحور امریکہ دشمنی ہونا چاہیے۔

اس کے بالکل برعکس دوسرا رویہ یہ ہے کہ امریکہ ایک سپر طاقت ہے جس کے بغیر اس دنیا میں کوئی طاقت ور بھی دم نہیں مار سکتا۔ امریکہ کی مخالفت کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ امریکہ کا حامی اور دوست بن کر جیا جائے۔ اس کے حضور میں اپنی عرض داشت تو پہنچائی جائے، تاہم عملاً راضی برضاے امریکہ کا انداز اختیار کیا جائے۔ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے امریکہ ناراض ہو۔ ہم امریکہ کی ناراضی پر قادر نہیں۔ اگر وہ ہم سے ناخوش ہوا تو وہ ہمارے لیے معاشی اور سیاسی پریشانیاں پیدا کر دے گا۔ عوام ہماری حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یوں ہمارا تختہ الٹ جائے گا۔

تیسرا رویہ یہ ہے کہ امریکی فیکٹر کو ایک حد سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے، بلکہ اصل توجہ اپنے ملک اور گھر کی حالت سدھارنے پر رکھی جائے۔ اگر ہمارے عوام مطمئن ہوں گے، سیاسی آزادی ہوگی، معاشی ترقی ہوگی اور ملک ٹیکنالوجی میں آگے بڑھتا جائے گا تو مفروضہ یا حقیقی، کوئی بیرونی سازش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ امریکہ ایک حد سے زیادہ ہمارے معاملات میں دخیل ہی نہ ہو سکے گا۔ دراصل یہ ہم ہیں جن کی اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے امریکہ فائدہ اٹھا کر دخل اندازی کے مواقع تلاش کر لیتا ہے۔ اس لیے امریکہ کو ایسا کوئی موقع دیا ہی نہیں جانا چاہیے۔ بین الاقوامی امور میں امریکہ سے تعلقات کار بھی رکھے جائیں اور اس سے ایک باوقار فاصلہ بھی رکھا جائے۔ کسی بھی معاملے میں بلاضرورت نہ امریکہ کی مخالفت کی جائے نہ حمایت، بلکہ ہر مسئلے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لے کر اصولی اور عملی، دونوں امور کو سامنے رکھ کر حکمت عملی بنائی جائے۔ مسلم دنیا میں فی الوقت صرف ملایشیا کسی حد تک اس رویے پر گامزن ہے۔

پاکستان کا ہر آدمی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ بازاروں، حجروں، بیٹھکوں، ڈرائینگ روموں غرض یہ کہ ہر محفل کا مرغوب ترین موضوع سیاسی گفتگو ہوتا ہے۔ ہر سیاسی گفتگو کی تان امریکہ پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ امریکی نظام اور امریکی اقدار سے متعلق ہمیں پوری آگاہی ہو تاکہ ہماری سوچ میں معروضیت پیدا ہو سکے۔

بنیادی حقائق اور مختصر تاریخ

ریاست ہاے متحدہ امریکہ کا رقبہ تقریباً چورانوے لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ گویا رقبے کے لحاظ سے یہ پاکستان سے تقریباً ۱۲ گنا بڑا ہے۔ فی کس آمدنی تقریباً ۴۰ ہزار ڈالر سالانہ ہے۔ یہ پچاس ریاستوں اور ایک وفاقی ضلع پر مشتمل ہے۔ اس کی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آبادی تقریباً ۲۷ کروڑ ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس اور دوسری طرف بحر الکاہل ہے۔ جبکہ شمال میں اسی کا ایک دوست ملک کینیڈا اور جنوب میں دونوں سمندروں کے علاوہ ایک غریب ملک میکسیکو ہے جس کا ہر باشندہ امریکہ جانے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ گویا امریکہ پر فوجی حملہ ناممکن حد تک مشکل ہے۔

امریکہ کی تاریخ پوری دنیا میں نرالی ہے۔ یہ درحقیقت ایک نیا ملک ہے جو آج سے پانچ سو سال قبل دریافت ہوا جہاں سترہویں صدی میں یورپ سے آبادکاروں کی آمد شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ افریقی غلاموں کو لانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ویسے تو ۱۴۹۷ء ہی میں سلطنت برطانیہ نے شمالی امریکہ کو اپنا علاقہ قرار دے دیا تھا، تاہم یہاں انگریزوں کی آمد تقریباً ایک صدی بعد شروع ہوئی۔ قدرتی وسائل سے مالامال اور وسیع وعریض زمین کے حامل ملک نے بے شمار لوگوں کو قسمت آزمائی کے لیے مہم جوئی پر آمادہ کر لیا۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی عدم رواداری اور آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے بھی ترک وطن کر لیا۔ چونکہ یہ سب لوگ ایک ترقی یافتہ ملک سے آئے تھے، اس لیے معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی ادارے بھی وجود میں آنے لگے۔ اگرچہ بظاہر حکومت تاج برطانیہ کی تھی، لیکن اصل اختیار منتخب اسمبلیوں کے پاس تھا۔ چونکہ یہاں ہر مذہب اور علاقوں کے لوگ آئے تھے اور ان کو مختلف کالونیوں میں اکٹھے رہنا تھا، اس لیے پہلے دن ہی سے بہت متنوع مذہبی اور تہذیبی زندگی وجود میں آگئی۔

۱۷۶۰ء میں سلطنت برطانیہ نے اس علاقے پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کے لیے مختلف ٹیکس لگانے شروع کیے اور مزید حکام اور افواج کو یہاں بھیجنا شروع کیا۔ اس کے خلاف امریکی عوام میں غم وغصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ کئی ریاستوں کی اسمبلیوں نے ان ٹیکسوں کو خلاف قانون قرار دیا اور عوامی سطح پر بھی احتجاج شروع ہوا۔

۱۷۷۳ء میں چائے کے ٹیکس پر نظر ثانی کی گئی اور یہ سارا کاروبار ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ دیا گیا۔ اس پر بڑا سخت احتجاج ہوا اور دسمبر ۱۷۷۳ء میں امریکی مزدوروں، جو ریڈ انڈینز کا لباس پہنے ہوئے تھے، نے چائے کی پتی کی ۳۴۲ پیٹیوں کو بوسٹن کے مقام پر سمندر میں پھینک دیا۔ اس مشہور واقعے کو بوسٹن ٹی پارٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اپریل ۱۷۷۵ میں تیرہ ریاستوں نے الحاق کر لیا اور جارج واشنگٹن کو امریکی فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ یوں اس نوزائیدہ ریاست اور برطانیہ کی آپس میں لڑائی شروع ہوگئی۔ ۴ جولائی ۱۷۷۶ کو باقاعدہ اعلان آزادی کیا گیا۔ یہ جنگ آزادی اگلے پانچ برس تک جاری رہی اور اس میں فرانس نے بھی برطانیہ کے خلاف امریکی افواج کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔ اس پورے وقت میں اور اس کے بعد بھی سارے ملک میں نظام حکومت کے متعلق مسلسل بحث جاری رہی۔ پہلے دن ہی سے تمام قائدین اور سب لوگوں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ ان کی بقا اور ترقی کی واحد ضمانت جمہوریت میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ بالکل ابتدا ہی سے جمہوری کلچر اس نئی مملکت کے اندر بنیادی قدر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس وفاق میں آہستہ آہستہ مزید ریاستیں بھی داخل ہوتی رہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس دوران میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان آویزش بڑھتی رہی۔اس آویزش کی اہم وجہ ''مسئلۂ غلامی'' تھا۔ مارچ ۱۸۶۱ میں لنکن کے عہدۂ صدارت سنبھالنے کے وقت جنوب کی ساری ریاستوں نے وفاق چھوڑنے کا اعلان کیا۔ اپریل ۱۸۶۱ میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ یہ لڑائی اگلے چار برس تک جاری رہی جس میں شمال کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور جنوب کی ساری ریاستیں ایک دفعہ پھر وفاق کا حصہ بن گئیں۔اس جنگ میں بھی دونوں طرف سے ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے۔اس خونی جنگ کے خاتمہ کے بعد ملکی تعمیرنو کا کام جوش وجذبے سے شروع ہوا۔غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا۔اس دوران میں بہت بڑی تعداد میں تارکین وطن امریکہ آکر آباد ہوئے۔جس کی وجہ سے آبادی بھی بہت بڑھ گئی اور ان لوگوں نے امریکی صنعت وحرفت کو آگے بڑھانے میں بھر پور کردار ادا کیا۔۱۸۹۸ء میں کیوبا کے مسئلے پر امریکہ اور اسپین کے درمیان لڑائی چھڑ گئی جس میں امریکہ فاتح رہا۔پہلی جنگ عظیم کے موقع پر پہلے چار سال کے دوران میں امریکہ غیر جانب دار رہا، اگرچہ اس کی ہمدردیاں مغربی طاقتوں کے ساتھ تھیں۔اس دوران میں جرمنی نے، اس شک کی بنیاد پر کہ امریکی جہازوں میں اتحادیوں کے لیے اسلحہ لے جایا جاتا ہے، کئی امریکی بحری جہازوں کو ڈبو دیا۔اس پر امریکہ نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔یوں آخری سال میں جرمنی کی شکست میں امریکہ نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔اس جنگ کے بعد امریکہ نے پہلی بین الاقوامی باڈی یعنی لیگ آف نیشنز میں سب سے سرگرم کردار ادا کیا۔

۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۳ء یعنی چار سال ملک سخت مالی بحران کی لپیٹ میں رہا۔اس کو ''گریٹ ڈپریشن'' کے سال کہا جاتا ہے۔تاہم سخت قانونی اور مالی اقدامات کی وجہ سے روزویلٹ نے اس بحران پر قابو پالیا۔

۷ ستمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے پرل ہاربر نامی امریکی بندرگاہ پر زبردست حملہ کیا جس کے نتیجے میں امریکہ نے پہلے جاپان اور پھر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔۱۹۴۵ میں امریکہ ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔۶ اگست کو صدر ٹرومین کے حکم سے ہیروشیما کے شہر پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا جس سے اسی ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے اور تقریباً ایک لاکھ شدید زخمی ہوئے۔اس کے تین دن بعد ناگاساکی کو ایٹم بم کا نشانہ بنایا گیا۔اس کے پانچ دن بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

جنگ عظیم دوم کے فوراً بعد امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی، اس لیے کہ روس نے اپنا دائرۂ اثر مشرقی یورپ اور ایشیا کے بہت سے ممالک تک پھیلا لیا۔ چنانچہ امریکہ نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی ممالک سے فوجی معاہدے کیے جس میں (NATO-North Atlantic Treaty Organization) بھی شامل تھا۔

۱۹۵۰ء میں جنوبی کوریا کو شمالی کوریا کے حملے کے خلاف مدافعت کے لیے امریکہ نے جنرل میک آرتھر کی قیادت میں فوج بھیجی۔اس فوج نے شمالی کوریا کو تقریباً فتح کر لیا، مگر جب یہ فوج دریائے یالو کے قریب پہنچی جو شمالی کوریا اور چین کی سرحد پر واقع ہے، تو دس لاکھ چینی فوج نے اس پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔جنرل میک آرتھر نے کانگریس کے ارکان کو خط لکھا جس میں اس نے چین پر بمباری اور حملہ کرنے کی اجازت نہ دینے پر صدر ٹرومین کی مذمت کی۔اس پر ٹرومین

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے اسے کمانڈ سے علیحدہ کر دیا۔اس کے بعد کچھ برس تک امریکہ نے خارجہ تعلقات میں احتیاط کی پالیسی اپنائی۔مثلاً ۱۹۵۴ء میں جب انڈوچائنا میں کمیونزم کی حامی قوم پرست قوتیں فرانس کے خلاف لڑ رہی تھیں تو امریکہ نے فرانس کی مدد نہیں کی۔۱۹۵۶ء میں ہنگری میں کمیونسٹ تسلط کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی، مگر امریکہ نے باغیوں کی کوئی مدد نہیں کی۔اسی طرح جب برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا تو امریکہ نے ان تینوں ممالک سے یہ قبضہ چھڑانے کے لیے ان کو معاشی مقاطعے کی دھمکی تو دی، لیکن روس کے مقابلے میں براہ راست آنے سے کتراتا رہا، تاہم روس کے مقابلے کے لیے اس نے کئی دفاعی معاہدے کیے جن میں سیٹو (Southeast Asia Treaty Organization) اور سینٹو (Central Middle Eastern Treaty Organisation) بہت اہم ہیں۔

اگست ۱۹۶۴ میں، جبکہ کمیونسٹ شمالی ویت نام نے جنوبی ویت نام پر حملہ کر کے اسے کافی حد تک مغلوب کر لیا تھا، صدر جانسن نے اس جنگ میں کود پڑنے اور جنوبی ویت نام کو کمیونسٹ غلبے سے بچانے کا اعلان کیا۔وہاں امریکہ نے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ فوجی بھیجے۔اگلے نو برس تک امریکی فوجی ویت نام کی لڑائی میں شریک رہے۔اس جنگ میں تقریباً اڑسٹھ ہزار امریکی فوجی مارے گئے۔ایک بڑی تعداد شدید زخمی ہوئی۔تقریباً دس ہزار امریکی طیارے تباہ ہوئے اور امریکی معیشت کو بھی اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔بالآخر صدر نکسن نے امریکہ کو اس ہاری ہوئی جنگ سے نکالا۔

صدر کارٹر کے وقت میں بھی امریکہ کو ایک زک پہنچی جب ۱۹۷۹ء میں امریکی اتحادی شہنشاہ ایران کو ایک عوامی بغاوت، جس کی قیادت مذہبی طبقہ کر رہا تھا، کے ذریعے سے تخت سے اتار دیا گیا۔تین نومبر ۱۹۷۹ء کو تہران میں امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنا لیا گیا۔ان سفارت کاروں کو رہا کرانے کے لیے کارٹر کی تمام کوششیں بشمول ملٹری ایکشن ناکام رہیں۔بالآخر سوا سال بعد ۲۰ جنوری ۱۹۸۱ کو صدر ریگن کی حلف برداری کے دن ایران نے ان یرغمالیوں کو رہا کر دیا۔

اپریل ۱۹۷۸ میں افغانستان میں نور محمد ترکئی کی قیادت میں صدر سردار داؤد کا تختہ الٹ کر کمیونسٹ انقلاب برپا کر دیا گیا۔اس پر افغانستان میں خانہ جنگی چھڑ گئی اور کمیونزم مخالف اسلامی عناصر نے دیہی علاقے کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔۲۵ دسمبر ۱۹۷۹ کو روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں۔اس پر امریکہ نے روس مخالف اسلامی عناصر کو اسلحہ، رقم اور سامان رسد کی فراہمی شروع کر دی۔اگلے آٹھ نو برس میں امریکہ نے ان عناصر کو دو ارب ڈالر کا اسلحہ دیا۔اتنی ہی مدد سعودی عرب نے بھی فراہم کی۔چین، ایران اور مصر نے بھی روس مخالف افواج کی پوری پوری مدد کی۔ستمبر ۱۹۸۶ میں امریکہ نے مجاہدین کو اینٹی ائیر کرافٹ اسٹنگر میزائل دینے شروع کیے۔ان میزائلوں نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔سیکڑوں روسی طیارے گرنے سے اس کی کمر ٹوٹ گئی۔اس جنگ میں پینتیس ہزار کے لگ بھگ روسی ہلاک ہوئے۔بالآخر روسی افواج کو افغانستان سے نکلنا پڑا اور فروری ۱۹۸۹ تک تمام روسی افغانستان سے واپس چلے گئے۔اس جنگ سے روس کو معاشی طور پر اتنا نقصان ہوا جس سے وہ سنبھل نہ سکا۔یہ امریکہ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔اس لیے کہ اپنا ایک بھی سپاہی مروائے بغیر اس نے روس کو عبرت ناک

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شکست دے دی۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا۔ اقوام متحدہ نے فوری طور پر اس کی مذمت کی۔ امریکہ کی سربراہی میں ۲۸ ملکوں پر مشتمل فوج بنائی گئی۔ عراق کو الٹی میٹم دیا گیا کہ وہ کویت پر قبضہ چھوڑ دے ورنہ ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ کے بعد اس کے خلاف فوجی ایکشن کیا جائے گا۔

عراق کی طرف سے انکار پر اس کے خلاف بمباری شروع کی گئی۔ پانچ ہفتے کی بمباری کے بعد زمینی حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ چار دن جاری رہا۔ عراق کی فوج افراتفری کے عالم میں کویت سے واپس ہوئی حتیٰ کہ انھوں نے جنوبی عراق بھی خالی کر دیا۔ اس جنگ میں تقریباً دو لاکھ عراقی فوجی اور سویلین کام آئے جب کہ امریکی افواج کا نقصان نہ ہونے کے برابر ہوا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ کویت اور سعودی عرب کو مستقبل کے ممکنہ عراقی جارحیت سے روکنے کے لیے کچھ امریکی افواج سعودی عرب اور کویت میں ٹھہر گئیں۔ امریکی افواج کے تمام اخراجات بھی سعودی عرب اور کویت نے ادا کیے۔ اس سے پہلے عراق ستمبر ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ جنگ جو اگست ۱۹۸۸ تک یعنی آٹھ برس جاری رہی، اس میں بھی چار لاکھ عراقی اور چھ لاکھ ایرانی مارے گئے تھے۔ جبکہ ان دونوں ممالک اور باقی عرب ممالک کے بیسیوں ارب ڈالر اس بے فائدہ جنگ کی نذر ہوئے۔

دسمبر ۱۹۹۱ میں یوگوسلاویہ کا شیرازہ بکھرنے کے بعد مسلم اکثریتی صوبے بوسنیا نے آزادی کا اعلان کیا۔ اس پر ہمسایہ عیسائی ریاست سربیا نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ بوسنیا میں بھی ۳۰ فی صد سرب باشندے رہایش پزیر تھے، اس لیے بوسنیا کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تین سال بوسنیا نے اپنا کامیاب دفاع کیا۔ پھر امریکہ کے دباؤ پر یورپی ممالک کی افواج نے نیٹو کی کمان کے تحت سربیا کی افواج اور بلغراد پر پانچ ہفتے تک فضائی حملے جاری رکھے۔ بالآخر سربیا مذاکرات پر آمادہ ہو گیا۔ امریکہ کے تحت مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں ''ڈیٹن امن سمجھوتا'' طے پایا اور مسلم اکثریتی بوسنیا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہو گیا۔ بعد میں جنگی مجرموں کی حیثیت سے کئی سرب لیڈروں پر بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ بوسنیا کی حکومت کو امریکہ اور یورپی اقوام نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ۶ ارب ڈالر کی امداد بھی دی۔

بوسنیا کے بالکل قریب کوسووو کا ایک اور مسلم اکثریتی علاقہ موجود ہے۔ اس علاقے کو بھی عیسائی آرتھوڈوکس سربیا سے بچانے کے لیے امریکہ کے دباؤ پر نیٹو کی افواج نے سربیا افواج پر زبردست بم باری کی۔ اس کے نتیجے میں یورپ کے اندر ایک اور مسلم ملک منصۂ شہود میں آ گیا۔

۱۹۹۸ سے امریکہ اسامہ بن لادن کے معاملے میں الجھ گیا۔ بن لادن جو سعودی عرب کے انتہائی بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۸۰ سے لے کر ۱۹۹۰ تک افغانستان میں تھے۔ خلیجی جنگ کے بعد جب سعودی عرب کی درخواست پر کچھ امریکی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

افواج وہیں ٹھہر گئیں تب بن لادن سعودی حکمرانوں اورامریکہ، دونوں کے خلاف ہو گئے۔۱۹۹۲کے بعد وہ چار سال سوڈان میں مقیم ہو کر اپنے ساتھیوں کی فوجی تربیت کرتے رہے۔ پھر وہ ۱۹۹۶ میں افغانستان چلے آئے۔ اگست ۱۹۹۶ میں انھوں نے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ان کی زیر سرکردگی بہت سے کیمپ بنائے گئے جہاں سیکڑوں عربوں اور دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مسلح تربیت دی جاتی تھی۔۲۳ فروری ۱۹۹۸ کو خوست کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے ایک فتوے کے ذریعے سے امریکہ اوراس کے اتحادی ممالک کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا اور کہا کہ ان ممالک کے ہر فوجی اور سویلین کو قتل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔اگست ۱۹۹۸ میں کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں میں کئی سو افراد ہلاک ہوئے۔امریکہ نے اس کا الزام القاعدہ پر لگایا اور افغانستان کی طالبان حکومت سے مطالبہ کیا کہ ملزموں کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔اقوام متحدہ کی طرف سے بھی اسی مضمون کا متفقہ مطالبہ کیا گیا۔اس کے بعد یمن کی بندرگاہ پر کول نامی بحری جہاز پر حملے کو بھی القاعدہ کی کارروائی قرار دیا گیا۔لیکن سب سے بڑا سانحہ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ کو پیش آیا۔جب انیس عرب خودکش ہائی جیکروں نے چار ہوائی جہاز اغوا کر کے دو جہازوں کو امریکہ اور نیویارک کی مشہور ترین اوراہم ترین عمارت ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا کر اس بلڈنگ کو زمین بوس کر دیا اوراس میں موجود چار ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔تیسرا جہاز امریکی افواج کے ہیڈ کوارٹر پینٹاگان سے جا ٹکرایا اور چوتھا جہاز اغوا ہونے کے بعد مسافروں اور ہائی جیکرز کے جھگڑے میں گر کر تباہ ہو گیا۔اس حملہ کے ضمن میں ''اہم ترین مشتبہ'' القاعدہ اور بن لادن کو قرار دیا گیا۔امریکہ نے بہت واضح الفاظ میں طالبان کو الٹی میٹم دیا کہ القاعدہ تنظیم کے اہم ارکان کو اس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا۔اقوام متحدہ نے بھی متفقہ قرارداد کے ذریعے سے یہی مطالبہ کیا۔مگر طالبان نے اس مطالبہ کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔جس کے نتیجے میں ۷ اکتوبر کو امریکہ نے شمالی اتحاد کی مدد سے طالبان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔دو مہینے کے اندر اندر طالبان حکومت ختم ہو گئی اور ۲۰ دسمبر کو بون معاہدے کی رو سے حامد کرزئی عبوری حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔امریکہ اوراس کی اتحادی افواج اب بھی افغانستان میں مقیم ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چند اہم معاشرتی پہلو

انفرادی آزادی

امریکی کلچر میں ذاتی پسند و ناپسند اور ذاتی کامیابی پر بہت غیر معمولی زور دیا جاتا ہے۔اس اعتبار سے یہ معاشرہ دنیا کے دوسرے معاشروں حتیٰ کہ یورپی معاشروں سے بھی بہت مختلف ہے۔ چونکہ ہر آدمی اپنی ذاتی حیثیت سے اس سرزمین پر آیا اور اس کے سامنے کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کا ایک موقع تھا۔ یہاں آنے والوں کی بڑی اکثریت مڈل کلاس یا غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھی،اس لیے اعلیٰ طبقے کا رکھ رکھاؤ اوراس کی مصنوعی اقدار یہاں منتقل نہیں ہوئیں۔ گویا پورا امریکہ درحقیقت تہذیبی اعتبار سے ایک مڈل کلاس سوسائٹی ہے جہاں کوئی بھی فرد اپنے آپ کو کسی بھی دوسرے فرد سے کم تر یا برتر نہیں سمجھتا۔اسی

لیے امریکی جلد بے تکلف ہونے والے، صاف گو اور دوستانہ طبیعت کے لوگ ہیں۔ دوسری سوسائٹیوں کے برعکس امریکی کلچر میں خاندانی وجاہت اور وراثتی دولت کوئی ذریعۂ عزت وافتخار نہیں، بلکہ اصل کارنامہ وہی ہے جو اپنے زور بازو سے انجام دیا جائے۔

یہ قدر اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے فرد کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی انسان قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور تشدد کی تبلیغ نہیں کرتا تو پھر وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے کہے۔ اس انفرادیت کی وجہ سے مقابلے کا رجحان بھی بہت زیادہ ہے۔ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ خود کچھ کر کے دکھائے۔ اسی قدر کی وجہ سے یہ معاشرہ قانونی تارکین وطن کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔

جمہوری اقدار

جمہوری کلچر اس معاشرے کے رگ و پے میں اسی طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ اس کے بغیر کوئی فرد اجتماعی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سوسائٹی بتدریج بادشاہت سے جمہوریت کی طرف نہیں آئی، بلکہ انفرادی آزادی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس نے آنکھ ہی جمہوریت کے ماحول میں کھولی ہے۔ سب لوگ پہلے دن سے یہ جان گئے کہ جمہوریت کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے ان کا ہر رہنما جمہوریت سے آخری درجے میں مخلص تھا۔ یہاں جمہوریت کا ہر ممکن تجربہ ہوا۔ یہاں کا پریس آزاد بھی ہے اور بے رحم بھی۔ یہاں ٹی وی چینلوں اور ریڈیو اسٹیشنوں پر حکومت کی اجارہ داری نہیں۔ بیشک کئی معاملات سے متعلق یہاں تعصب بھی برتا جاتا ہے اور جس معاملے پر اجماع ہو، وہاں مخالفین کی بات مشکل ہی سے سنی جاتی ہے، مگر سب کچھ جمہوری دائرے کے اندر ہوتا ہے۔ ہر فرد کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے اندر بھی کسی پارٹی لیڈر یا کسی سنٹرل ایگزیکٹیو کو ویٹو پاور حاصل نہیں ہوتا۔ گویا جس طرح ایک فرد کی زندگی انفرادی آزادی سے عبارت ہے، اسی طرح اجتماعی زندگی کی بنیادی قدر جمہوریت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مذہبی لگاؤ

دوسرے ترقی یافتہ معاشروں کے برعکس امریکہ میں مذہب کی گرفت کافی حد تک مضبوط ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد چرچ سے اپنا تعلق رکھتی ہے اور اپنے عیسائی ہونے کا شعور رکھتی ہے۔ مذہبی پروگراموں اور مذہبی رفاہی اداروں میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بے شمار لوگ مذہب کی ترویج اور خدمت کو اپنا بنیادی مقصد زندگی بنا لیتے ہیں اور اس کے لیے دنیا کے دور دراز دشوار گزار گوشوں میں کئی کئی سال تک خدمت انجام دیتے ہیں۔ گویا مذہب یہاں ایک زندہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ دوسرے مذاہب میں بھی دلچسپی لیتے ہیں اور اس ضمن میں تبادلۂ خیال کو پسند کیا جاتا ہے۔

اجتماعی اخلاقیات

امریکی معاشرے میں سچائی، امانت، دیانت اور انصاف کا عام چلن ہے۔ جھوٹ بولنے، غلط بیانی کرنے اور ملاوٹ کرنے کو بدترین برائیاں سمجھا جاتا ہے۔ ناپ تول میں کوئی بے ایمانی نہیں کی جاتی۔ قانون کی پابندی کو ہر انسان لازمۂ حیات

تصور کرتا ہے۔ ہر انسان سچی گواہی دینے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتا ہے۔ ہر جگہ محنت کی قدر ہے۔ ہر فرد کی اصل قیمت اس کی صلاحیت و قابلیت ہے۔ رشوت و ناجائز سفارش ناقابل تصور ہے۔ ہر بات دلیل کی بنیاد پر کہی اور سنی جاتی ہے، خود تنقیدی عام ہے۔ جذباتیت بہت کم ہے۔ برداشت اور مکالمہ کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔

اس سوسائٹی میں ہر فرد کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اسے اپنے وقت، صلاحیت اور سرمائے کا کچھ حصہ لازماً معاشرے کی خدمت میں صرف کرنا ہے۔ یہ خدمت ہمہ جہت اور نہایت متنوع ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مفلوک الحال طبقات اور غریب مریضوں کے لیے بے شمار ادارے موجود ہیں۔ مستحق طلبہ کی مدد کے لیے بیسیوں ادارے ہیں۔ معاشرے میں کسی اچھی بات یا کسی قدر کو عام کرنے کے لیے کئی انجمنیں مصروف عمل ہیں۔ مثلاً ایسی تنظیمیں بھی موجود ہیں جو ایڈز سے بچاؤ کے لیے نوجوانوں میں یہ تحریک چلاتی ہیں کہ وہ شادی سے پہلے جنسی تعلق سے احتراز کریں۔ خاندانی نظام کی بحالی کے لیے کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق کے تحفظ، پرانے آرٹ و ادب کے تحفظ، غرض یہ کہ ہر قابل تصور موضوع کے لیے لوگوں نے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ گویا ہر فرد اجتماعیت کی خدمت کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دیتا ہے۔ جنسی اعتبار سے امریکی سوسائٹی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ تاہم بعض یورپی معاشروں کے برعکس یہ مادر پدر آزاد معاشرہ نہیں ہے۔ کم لباس، مخلوط محفلیں، کلب اور ڈانس روزمرہ کا معمول ہیں، تاہم فری سیکس بہت کم ہے اور اسے بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ راہ چلتے بوس و کنار کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کے رشتے کی میاں بیوی کے رشتے کی طرح حفاظت کی جاتی ہے، سوائے اس کے کہ میاں بیوی کا رشتہ قانونی اور دستاویزی ہوتا ہے، جب کہ دوسرے رشتے کے لیے کسی دستاویز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف سنگل مدرز یعنی اکیلی مائیں بھی عام ہیں۔ یہاں کسی سے جنسی تعلق بنانا آسان نہیں تو دوسری طرف ہم جنسیت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ دس فی صد سے کم لوگ اس میں آلودہ ہیں اور معاشرے کی ایک بڑی اکثریت اس سے نفرت کرتی ہے۔ گویا جنس اور لباس کے معاملے میں پابندی کسی چیز پر نہیں۔ اس لیے کہ ایسی پابندیاں ان کے خیال میں انفرادی آزادی کے خلاف ہیں، تاہم سوسائٹی کے اپنے قواعد اور اقدار موجود ہیں جن کا خیال رکھا جاتا ہے۔

امریکہ کی ایک قدر سیکولرزم ہے۔ تاہم یہ سیکولرزم بعض یورپی ممالک کے سیکولرزم سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں سیکولرزم کا مطلب ہر مذہب کے لیے احترام اور رواداری ہے۔ اسی لیے یہاں کسی بھی مذہب کے مطابق عبادت کرنے یا لباس پہننے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فرانس میں مسلمان خواتین کے نقاب استعمال کرنے کو مذہب کی علامت قرار دے کر سرکاری اداروں میں ایسی خواتین کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ دوسری طرف امریکہ میں اس کو انفرادی آزادی کا مظہر قرار دے کر اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

فلاحی مملکت کا تصور

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سب سے امیر ملک میں جا بجا غربت کے مناظر موجود ہیں۔ ملک کے دارالحکومت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

واشنگٹن میں، جس کی آبادی چھ لاکھ ہے، ہر وقت تقریباً پندرہ ہزار افراد بے گھر اور بے آسرا فٹ پاتھ پر بسیرا کرتے ہیں۔ یہ غربت افریقی امریکیوں یعنی کالوں اور قدیم امریکیوں یعنی ریڈ انڈینیز میں زیادہ ہے اور یورپی امریکیوں یعنی سفید فاموں میں بہت کم ہے۔ دراصل فلاحی مملکت کا امریکی تصور بھی یورپی تصور سے بہت مختلف ہے۔ یورپی فلاحی ملکوں میں ریاست مہد سے لحد تک یعنی پوری زندگی کے لیے ایک فرد کی ذمہ داری لیتی ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ ٹیکس لگانے پڑتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں یہ ٹیکس آمدن کے پچاس فیصد سے زیادہ ہوجاتے ہیں چونکہ حقیقی فلاحی مملکتیں یعنی سکینڈے نیوین ملک بہت چھوٹے بھی ہیں۔ انھیں کوئی بیرونی خطرہ بھی درپیش نہیں اور انھیں بین الاقوامی تنازعات میں کوئی کردار بھی ادا نہیں کرنا ہوتا، اس لیے ان کے لیے فلاحی مملکت کے تقاضوں کو نبھانا ممکن ہوجاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس امریکی نقطۂ نظر یہ ہے کہ فلاحی مملکت کا تصور اپنی انتہائی شکل میں مارکیٹ اکانومی کے تصور کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ سے عام فرد پر اتنے زیادہ ٹیکس لگ جاتے ہیں جن سے انفرادی مسابقت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور فرد کی آزادی کا تصور مجروح ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیلز ٹیکس ہو، انکم ٹیکس ہو یا ویلتھ ٹیکس، کسی کا بھی تناسب ۵ فی صد سے زیادہ نہیں۔ اکثر ریاستوں میں انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس میں سے صرف ایک موجود ہوتا ہے۔

امریکہ میں ابتدائی بارہ برس کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ باقی ہر چیز کے لیے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ فلاحی مملکت کو امریکیوں نے ریاست کی ذمہ داری سے الگ کر کے سوسائٹی کی ذمہ داری بنا دیا ہے۔ اس لیے سارے ملک میں ایسے غیر سرکاری اداروں کا جال بچھا ہوا ہے جو کمزور طبقے کی تعلیم، صحت، کھانے اور رہایش کا خیال رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہر مستحق فرد ان خدمات سے مستفید ہوجاتا ہے۔ مثلاً ایسے ادارے موجود ہیں جو بے سہارا لوگوں کو ناشتہ کراتے ہیں، کوئی تنظیم مستقلاً شام کے کھانے کا بندوبست کرتی ہے، کچھ تنظیمیں بے گھر لوگوں کے لیے چند ہفتوں کے لیے سر چھپانے کا بندوبست کرتی ہیں، کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو ہر مستحق فرد کو طبی سہولیات فراہم کرتے ہیں، خواہ وہ امریکہ میں غیر قانونی طریقے پر ہی کیوں نہ مقیم ہو۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی باصلاحیت طالب علم سرمائے کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائے۔ کوئی نہ کوئی غیر سرکاری فلاحی تنظیم اس کو سنبھال لے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امریکہ کا جمہوری نظام

برطانوی جمہوریت کے برعکس امریکی جمہوریت براہ راست ہے۔ یعنی پارلیمانی کے بجائے صدارتی نظام ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کے اندر بے شمار چیزیں برطانیہ سے الٹ ہیں۔ وہاں ٹریفک بائیں ہاتھ ہے اور یہاں دائیں ہاتھ، وہاں کلومیٹر ہیں اور یہاں میل، وہاں بجلی دوسو بیس وولٹ ہے اور یہاں اس سے الٹ، وہاں لوگ اور بچے خاموش رہتے ہیں، بغیر تعارف کے ایک دوسرے سے گفتگو کے روادار نہیں ہوتے، یہاں لوگ اور بچے خوب شور مچاتے ہیں اور ایک دوسرے سے

گفتگو اور ہنسی مذاق کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں، وہاں بجلی کے سوئچ اوپر سے نیچے کی طرف آن ہوتے ہیں، یہاں نیچے سے اوپر کی طرف آن ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ یوں لگتا ہے جیسے امریکیوں نے ہر چیز جان بوجھ کر انگریزوں سے الٹ رکھی ہے۔ بہرحال یہ براہ راست جمہوریت ہر جگہ ہے۔ میئر ہو، ریاست کا گورنر ہو، عدالت کا جج ہو یا ملک کا صدر، ہر کوئی براہ راست عوامی ووٹ سے منتخب ہوتا ہے۔

دو یا تین پارٹی نظام

مدت دراز سے امریکہ میں دو پارٹی نظام رائج ہے ایک رپبلیکن پارٹی اور دوسری ڈیموکریٹک پارٹی۔ وقتاً فوقتاً کوئی تیسری پارٹی بھی ابھر کر کچھ عرصے کے لیے ارتعاش پیدا کرتی ہے، مگر جلد بیٹھ جاتی ہے۔ جیسے آج کل گرین پارٹی بھی میدان میں موجود ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کی بنیادیں مضبوط نہیں ہو سکیں۔

امریکہ میں دو پارٹی نظام کو قائم ہوتے اور جڑ پکڑتے پکڑتے بہت وقت لگا ہے۔ رپبلیکن پارٹی امریکی کلچر، امریکی اقدار اور امریکہ کی بالاتری پر یقین رکھتی ہے۔ یہ پارٹی خاندانی اقدار اور مذہب کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہے۔ خارجہ تعلقات کے ضمن میں یہ پارٹی امریکی مفادات کو بہت زیادہ دیکھتی ہے۔ اس کے برعکس ڈیموکریٹک پارٹی انسانی حقوق، عورتوں، اقلیتوں، مزدور طبقہ اور تارکین وطن کی جانب ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے۔ تاہم ان دونوں پارٹیوں میں نمایاں حد فاصل تلاش کرنا مشکل ہے۔ ہر پارٹی کے اندر خیالات کے اعتبار سے مزید تین گروپ بن جاتے ہیں۔ یعنی لبرل، ماڈریٹ اور کنزرویٹیو۔ ان مختلف شیڈز کی وجہ سے بسا اوقات بڑی دلچسپ صورت حال بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک کنزرویٹیو ڈیموکریٹک کے خیالات اور ایک لبرل رپبلیکن کے نظریات میں حقیقتاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں پارٹیوں کے ماڈریٹ بھی تقریباً ہم رنگ ہی ہوتے ہیں۔

پارٹیوں کی اصل تنظیم ریاستی سطح پر ہوتی ہے۔ ملکی سطح کی تنظیم بڑی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے اور وہ صرف صدارتی انتخاب کے موقع پر سرگرم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی کام نہیں ہوتا۔

ہر ووٹر کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ ووٹرز لسٹ میں اپنے آپ کو بطور رپبلیکن یا ڈیموکریٹ یا کسی بھی پارٹی کے ساتھ ملحق ظاہر کرے اور چاہے تو آزاد رہے۔ جب وہ اپنے آپ کو کسی پارٹی سے وابستہ ظاہر کرے گا تو وہ خود بخود اس پارٹی کے تمام معاملات میں بطور رکن ووٹ دینے کا اہل ہو جائے گا۔ وہ جب چاہے اپنی وابستگی تبدیل کر سکتا ہے۔

امیدواروں کا چناؤ

امریکہ میں پارٹی ڈکٹیٹر شپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہر عہدہ کے لیے اپنی پارٹی کے امیدوار کا چناؤ بھی اس حلقے سے تعلق رکھنے والے پارٹی ممبر کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ مثلاً ایک ریاست سے رپبلیکن پارٹی کی طرف سے سینٹ کی ایک سیٹ کے لیے دو افراد امیدوار ہیں۔ یہ دونوں افراد اپنے لیے بھرپور انتخابی مہم چلائیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عام

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انتخابات میں ہوتا ہے۔ایک خاص تاریخ کو ریاست میں ''پرائمریز''،یعنی پرائمری الیکشن ہوں گے۔(ان پرائمریز میں مختلف عہدوں کے لیے دوسرے امیدوار بھی اپنی اپنی پارٹی کے اندر انتخاب لڑ رہے ہوں گے)۔جن ووٹروں نے اپنے آپ کو بحیثیت ریپبلیکن ووٹر رجسٹرڈ کیا ہوگا، وہ ان دونوں امیدواروں میں سے کسی ایک کو ووٹ دیں گے۔اس طرح جو امیدوار بھی پارٹی کا یہ اندرونی انتخاب جیت جائے گا۔وہ ریاستی انتخاب میں مخالف پارٹی کے امیدوار کے ساتھ مقابلہ کرے گا۔گویا یہاں پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹیو یا سنٹرل پارٹی ٹکٹ کمیٹی کی اجارہ داری کا کوئی تصور نہیں۔

ریاستی اسمبلی اور اس کے اختیارات

امریکہ سے باہر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے اندر شاید صدر، کانگریس اور سینٹ ہی سب کچھ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ امریکی وفاق کے پاس چند ہی اختیارات ہیں جب کہ عام انسان سے تعلق رکھنے والے تمام تر اختیارات ریاست یعنی صوبے کے پاس ہوتے ہیں۔ریاست کا گورنر بھی براہ راست منتخب ہوتا ہے اور ریاستی اسمبلی بھی براہ راست منتخب ہوتی ہے۔گورنر کے پاس عمومی انتظامی اختیارات ہوتے ہیں جب کہ ریاستی اسمبلی قانون سازی کرتی ہے اور بجٹ پاس کرتی ہے۔

وفاقی کانگریس

یہ ایوان درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک ایوان نمائندگان اور دوسرا سینٹ۔ان دونوں کے مجموعے کو کانگریس کہا جاتا ہے،مگر کبھی کبھی ایوان نمائندگان کو بھی کانگریس کہہ دیا جاتا ہے۔ایوان نمائندگان کا ہر رکن آبادی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔آج کل اس کے ارکان کی تعداد چار سو ہے۔جب کہ ہر ریاست سے دو سینیٹر منتخب کیے جاتے ہیں۔اس طرح سینیٹرز کی تعداد ہمیشہ ایک سو رہتی ہے۔ایوان نمائندگان کی میعاد صرف دو برس ہوتی ہے اور سینٹ کی میعاد چھ برس۔ہر دو سال بعد ایک تہائی سینیٹرز ریٹائر ہو جاتے ہیں اور ان کے انتخاب کے لیے پوری ریاست کو حلقہ تصور کیا جاتا ہے۔ایوان نمائندگان کے لیے اتنی مختصر میعاد اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ وہ کبھی بھی اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام سے کٹنے نہ پائیں اور الیکشن میں کامیاب ہوتے ہی وہ اگلے الیکشن کے لیے تیاری شروع کر دیں۔ ہفتے میں عام طور پر ایوان نمائندگان کے ہر رکن کے تین چار دن واشنگٹن میں گزرتے ہیں اور تین یا چار دن اپنے حلقۂ انتخاب میں۔حقیقت یہ ہے کہ ایوان نمائندگان کے رکن کی حیثیت سے ذمہ داری سرانجام دینا ایک مشکل کام ہے۔

سینٹ کی میعاد چھ برس اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ ایک دفعہ منتخب ہونے کے بعد ان ارکین پر اپنے حلقۂ انتخاب کا زیادہ دباؤ نہ رہے اور وہ اطمینان و دلجمعی کے ساتھ قانون سازی کا کام کر سکیں۔تاہم ان کو بھی اپنے حلقۂ انتخاب سے پورا رابطہ رکھنا پڑتا ہے،اس لیے کہ ان کا انتخاب (پاکستان کے برعکس) ریاستی اسمبلیاں نہیں، بلکہ براہ راست عوام کرتے ہیں۔ہر نمائندے کا واشنگٹن میں ایک دفتر اور اپنے حلقے میں پانچ چھ دفاتر ہوتے ہیں۔ان دفاتر کا اسٹاف وہ خود مقرر کرتا ہے اور اس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔اس طرح وہ ہمہ وقت اپنے حلقۂ انتخاب سے رابطے میں رہتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کسی بھی مسئلے پر بحث ،موقف سازی اور ووٹنگ کے وقت کسی بھی ممبر کے لیے پارٹی ڈسپلن کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہرممبر اپنے ضمیر کے مطابق بات کرتا ہے اور ووٹ دیتا ہے۔ ممبر کے لیے پارٹی تبدیل کرنے یا اپنی پارٹی چھوڑ کر آزاد ممبر بننے پر بھی کوئی قانونی پابندی نہیں ۔ تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ پچھلے دس سال میں شاید صرف ایک دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک رکن نے برسراقتدار پارٹی چھوڑ کر آزاد ممبر بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

صدارتی انتخابات

امریکہ کے صدارتی انتخابات کا طریق کار انتہائی دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ سب سے پہلے ہر ریاست کے اندر ہر بڑی پارٹی کے امیدواروں کے درمیان باہمی مقابلہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے تین افراد صدارتی امیدوار بننا چاہتے ہیں تو ان میں سے ایک متفقہ امیدوار کے انتخاب کے لیے آپس میں مقابلہ ہوگا۔ اس انتخاب کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ، جس کے لیے ریاست آئیوا بہت شہرت رکھتی ہے، کاکس (Caxcus) کا طریقہ کہلاتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک چھوٹے یونٹ (مثلاً کسی چھوٹے قصبے) کے اس پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر فرد اپنے پسندیدہ امیدوار کا نام لیتا ہے۔ اگر امیدوار زیادہ ہوں تو سب سے کم ووٹ لینے والے امیدوار کا نام ڈراپ ہوتا رہتا ہے اور نئے سرے سے انتخاب ہوتا ہے حتیٰ کہ آخر میں دو امیدوار رہ جاتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک یہ کاکس جیت لیتا ہے۔ یہ تمام پراسیس ایک ہی وقت میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس طرح جب ریاست کے تمام کاکسوں کے نتائج آ جاتے ہیں تو جس امیدوار نے زیادہ کاکس (نہ کہ زیادہ ووٹوں کی تعداد) میں کامیابی حاصل کی ہوتی ہے، اسے اس ریاست کی طرف سے فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم اس کامیابی سے کوئی امیدوار واقعتاً امیدوار نہیں بن جاتا، اس لیے کہ اس ضمن میں اصل فیصلہ قومی نامزدگی کنونشن (National Nominating Convention) کے ڈیلی گیٹس کے اکثریتی ووٹ سے ہوتا ہے۔ اب اکثر ریاستوں میں کاکس کا رواج نہیں رہا۔

کسی پارٹی کے صدارتی امیدوار کا اصل فیصلہ ڈیلی گیٹس کرتے ہیں۔ اس موقع کے لیے ہر ریاست میں ''پرائمریز'' منعقد ہوتے ہیں۔ ان پرائمریز کے لیے ہر امیدوار اپنا پینل کھڑا کرتا ہے۔ ڈیلی گیٹس کی تعداد ریاست کی آبادی کی تناسب سے ہوتی ہے۔ ہر ریاست میں باقاعدہ سرکاری طور پر الیکشن منعقد ہوتا ہے جس میں اس پارٹی سے تعلق رکھنے والے ممبر ڈیلیگیٹس کا انتخاب کرتے ہیں۔ (یہ بات پہلے بیان کی چکی ہے کہ الیکشن کمیشن کے پاس بحیثیت ووٹر اپنے آپ کو رجسٹر کراتے وقت ہر فرد کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنی پسندیدہ پارٹی کا نام بتائے یا آزاد رہے۔ پسندیدہ پارٹی کا نام بتانے والا خود بخود اس پارٹی کا ممبر بن جاتا ہے۔) اس انتخاب سے پہلے بھی پورے ملک میں ہر امیدوار اپنی پارٹی کے اندر اپنی انتخابی مہم چلاتا ہے۔ جب تمام ریاستوں سے ڈیلی گیٹ منتخب ہو جاتے ہیں تو پھر نیشنل کنونشن منعقد ہوتا ہے جس میں متفقہ امیدوار کا باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے۔ نتیجہ ہر کسی کو پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر ریاست کی پارٹی ''الیکٹرل کالج''، یعنی انتخابی ادارے کے افراد

کا تقرر کرتی ہے۔ان کی تعداد ہر ریاست کے اراکین سینٹ اور اراکین ایوان نمائندگان کی مجموعی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔ یہ افراد عام طور پر پارٹی کے وفادار ترین ارکان ہوتے ہیں۔امریکہ میں ہر چوتھا سال صدارتی انتخابات کا سال ہوتا ہے۔اس سال نومبر کی پہلی پیر کو صدارتی انتخابات کے لیے پولنگ ہوتی ہے،لیکن یوں نہیں ہوتا کہ جس امیدوار نے سب سے زیادہ ووٹ لے لیے ہوں، اسے کامیاب قرار دے دیا جائے، بلکہ ہوتا یوں ہے کہ جس ریاست میں جس امیدوار کو زیادہ ووٹ پڑے ہوتے ہیں، اس ریاست سے اس پارٹی کا پورا الیکٹرل کالج کامیاب قرار دے دیا جاتا ہے۔مثلاً کسی ریاست میں الیکٹرل کالج کے ارکان کی تعداد دس ہے۔اس ریاست میں تین لاکھ عام ووٹ رپبلیکن پارٹی کا امیدوار لے لیتا ہے۔دو لاکھ نوے ہزار ووٹ ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کے حق میں پڑ جاتے ہیں اور ایک لاکھ ووٹ گرین پارٹی لے لیتی ہے۔تو اس ریاست سے رپبلیکن پارٹی کے دس کے دس ارکان الیکٹرکل کالج کامیاب قرار دے دیے جائیں گے۔

صدارت کا اصل فیصلہ عام ووٹوں کی اکثریت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تمام ریاستوں کے الیکٹرل کالج کے ارکان کی اکثریتی رائے سے ہوتا ہے۔چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ عام اکثریتی ووٹ ایک امیدوار کے حق میں پڑے ہوں اور بالفعل دوسرا امیدوار الیکٹرل کالج کے ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو جائے۔مثلاً ۲۰۰۰ء کے انتخاب میں اکثریتی ووٹ الگور کے حق میں پڑے تھے،مگر الیکٹرل کالج کے طریقۂ کار کی وجہ سے جارج بش الیکشن جیت گئے۔

اگرچہ الیکٹرل کالج کے افراد سرکاری طور پر عام انتخاب کے چند دن بعد ووٹ دیتے ہیں۔تاہم عام ووٹوں کی گنتی مکمل ہوتے ہی الیکٹرل کالج میں ہر پارٹی کے ارکان کی تعداد خود بخود معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے غیر سرکاری طور پر فوری اعلان کامیابی ممکن ہوتا ہے۔

بادی النظر میں الیکٹرل کالج کا ادارہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔تاہم امریکیوں کے خیال میں دو نکات کی بنیاد پر اس کی افادیت ہے۔ایک یہ کہ اس سے ہر ریاست کی طاقت اور اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔اور اس طریقۂ کار کی وجہ سے کسی چھوٹی ریاست کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دوسرا یہ کہ اس نظام کی وجہ سے کسی تیسری پارٹی کے لیے میدان پر قبضہ یا تیسرے امیدوار کی جیت عملاً ناممکن ہو جاتی ہے۔اس لیے تیسری پارٹی یا تیسرا امیدوار کسی بڑی پارٹی کے ووٹ تو خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے یا اپنا احتجاج تو ریکارڈ کر سکتا ہے،مگر عملاً وائٹ ہاؤس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔

امریکی انتخابات میں سیاسی اخلاقیات کی اہمیت

درج بالا صفحات میں امریکی انتخابی نظام کا جو مختصر سا خاکہ بیان کیا گیا ہے، اس سے ایک عام قاری بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اگر سیاست دانوں میں سے کچھ مفسد اور بیمار ذہن کے لوگ اس سسٹم سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں تو ایک مختصر عرصے میں یہ نظام بالکل بیٹھ سکتا ہے۔مثلاً اس نظام کے تحت اگر کوئی پارٹی چاہے تو اپنی مخالف پارٹی کی طرف سے ایک نسبتاً کمزور امیدوار کو نامزد کرا سکتی ہے۔وہ یوں کہ یہ پارٹی اپنے کچھ لوگوں کو مخالف پارٹی کا رکن بنوا دے اور وہ پرائمریز میں کسی کمزور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امیدوار کے حق میں رائے دے دیں۔ اسی طرح امریکی سسٹم میں فلور کراسنگ پر کہیں بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی پارٹی کے منتخب ممبر پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ اسے لازماً اپنی پارٹی پالیسی یا پارٹی لائن یا کسی خاص موقف کے حق میں ووٹ دینا ہے۔ اس پر واحد قدغن اس کے اپنے ضمیر کی ہے۔ حتیٰ کہ الیکٹرل کالج کے ارکان، جن کا واحد کام اپنے صدارتی امیدوار کے حق میں چار برس میں صرف ایک دفعہ ووٹ دینا ہوتا ہے، یہ بھی اپنے پارٹی امیدوار کے حق میں ووٹ دینے کی پابند نہیں ہے۔ اس لیے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات کسی پارٹی کا کوئی الیکٹرل کالج کا رکن علی الاعلان اپنی پارٹی کے صدارتی امیدوار کے خلاف بطور احتجاج ووٹ دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ بتا دیتا ہے کہ وہ کس بات پر علامتی احتجاج کر رہا ہے۔ یہ احتجاج بھی وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب اسے یہ علم ہو کہ اس کے مخالفانہ ووٹ سے اس کی پارٹی کے امیدوار کی جیت یا ہار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اور مزید لطف کی بات یہ کہ کسی بھی معاملے میں مخالفانہ ووٹ دینے والے کسی بھی منتخب یا غیر منتخب رکن کو پارٹی سے بھی نہیں نکالا جا سکتا، اس لیے کہ امریکہ میں کسی فرد کو پارٹی سے نکالنے کا کوئی سسٹم موجود ہی نہیں۔ گویا امریکی سیاسی نظام میں بے شمار خامیاں (loop-holes) موجود ہیں۔ اگر اس سسٹم کو کوئی چیز تھامے ہوئے ہے تو وہ امریکی سیاست دانوں کا اجتماعی سیاسی اخلاقیات اور اپنے ضمیر کی آواز پر سختی سے جمے رہنا ہے۔ فی الوقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکی سیاست دان اجتماعی سیاسی اخلاقیات کی عمومی پیروی کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میڈیا اور سیاست

امریکی میڈیا، خواہ وہ پرائیویٹ ٹی وی چینل ہوں یا اخبارات، بنیادی طور پر کمرشل ادارے ہوتے ہیں۔ تاہم ان میں سے ہر ادارے کا اپنا ایک موقف، طرز فکر اور بنیادی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ادارے سیاست وحکومت کے لیے ایک بے رحم محتسب کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ عوام کو نت نئی چیزوں سے روشناس کرنے کی دوڑ میں ہر ادارے کی اپنی انویسٹی گیشن ٹیمیں ہوتی ہیں۔ وہاں کی اصل رپورٹنگ ہوتی ہی تحقیقاتی ہے۔ سیاسی لیڈر اول تو بیانات دیتے ہی نہیں اور اگر دیں بھی تو انھیں کوئی چھاپنے کا تکلف گوارا نہیں کرتا۔ قانونی طور پر بھی صحافیوں (بلکہ ہر امریکی) کو ہر محکمے اور شعبے کے متعلق سب کچھ جاننے کا اختیار ہوتا ہے۔ اس لیے عملاً کوئی بات چھپانی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس سخت گیر نقاد کے ہوتے ہوئے کوئی سیاست کار یا ذمہ دار فرد کوئی غلط کام کرتے ہوئے ہزار مرتبہ سوچتا ہے۔ واٹر گیٹ اسکینڈل کو طشت از بام کرنے کا کارنامہ ایک صحافی نے ہی انجام دیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ رپبلیکن پارٹی کے کچھ لوگوں نے ڈیموکریٹک پارٹی کے مرکزی دفتر واٹر گیٹ بلڈنگ میں جاسوسی آلات نصب کر دیے تھے تاکہ ان کی نج کی گفتگو سے باخبر رہا جا سکے۔ اس اسکینڈل کے نتیجے میں نکسن جیسے طاقت ور صدر کو وہائٹ ہاؤس سے رخصت ہونا پڑا تھا۔

عدلیہ اور جمہوریت

امریکی نظام کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہاں ریاستی سطح پر کئی جج بھی یا تو منتخب کیے جاتے ہیں اور یا ان کو عام ووٹرز کی

تائید یا عدم تائید کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ گویا اگر کوئی جج سست اور کام چور ہو، اس کے فیصلے مفاد عامہ اور مصالح عمومی کے مطابق نہ ہوں یا اس کی عمومی شہرت ٹھیک نہ ہو تو عوام اسے کرسی عدالت سے کھینچ سکتے ہیں۔

وفاقی عدالت کی نشست کے لیے اصل نامزدگی تو صدر کرتا ہے، مگر اس کی نامزدگی کی توثیق دونوں ایوانوں پر مشتمل کمیٹی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ چونکہ دونوں ایوانوں میں دونوں پارٹیوں کی نشستوں میں محض انیس بیس ہی کا فرق ہوتا ہے، اس لیے کمیٹی میں دونوں پارٹیوں کے ارکان کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے۔ اس کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہر جج کی تقرری پر صدر اور دونوں بڑی پارٹیوں کا اتفاق رائے ضروری ہے۔ عدالت عالیہ کا جج کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتا۔ اگر عمر رسیدگی کی بنا پر وہ خود کرسی عدالت چھوڑنا چاہے، تو الگ بات ہے، مگر مواخذے کی کسی تحریک کو چھوڑ کر اسے برطرف نہیں کیا سکتا۔ اس طرح وہ ہر طرح کے دباؤ اور ترغیب و تحریص سے بالاتر ہو کر فیصلے کرتا ہے۔

انتخابات اور دولت

امریکی انتخابات میں دولت کا بے تحاشا استعمال ہوتا ہے۔ کانگریس کا ہر امیدوار چار سے لے کر دس ملین ڈالر تک خرچ کرتا ہے۔ گویا چوبیس کروڑ سے لے کر ساٹھ کروڑ روپے تک۔ سینٹ کا ہر امیدوار چھ سے لے کر بیس ملین ڈالر یعنی چھتیس کروڑ روپے سے ایک ارب بیس کروڑ روپے تک صرف کرتا ہے۔ جب کہ صدارتی انتخاب میں ہر امیدوار کی طرف سے چار سو سے لے کر چھ سو ملین ڈالر یعنی دو ارب چالیس کروڑ سے لے کر تین ارب ساٹھ کروڑ روپے تک صرف ہوتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس رقم کے آمد و خرچ کا مکمل حساب رکھا جاتا ہے۔ انتخاب کے لیے ہر فرد ایک خاص حد تک ایک امیدوار کو چندہ دے سکتا ہے، جب کہ اداروں کے لیے بعض حالات میں حد موجود ہے اور بعض حالات میں کوئی حد نہیں۔ تمام ادارے یہ رقم علی الاعلان دیتے ہیں اور اس لیے دیتے ہیں کہ ان کا پسندیدہ امیدوار اقتدار میں آ کر ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

امیدواروں کا ایک بڑا وقت اپنے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں گزرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھی عوامی رابطے اور مختلف اداروں اور گروپوں کے مسائل اور نقطۂ نظر جاننے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر بڑے چندے کے لیے کوئی پروگرام منعقد کیا جاتا ہے جس میں باہمی دلچسپی کے امور پر تقاریر اور تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ چندے کی اس رقم کے ایک ایک پیسے کا حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ اس کا باقاعدہ آڈٹ ہوتا ہے۔ اگرچہ نظری طور پر اس میں خرد برد کے بہت سے امکانات ہو سکتے ہیں، مگر عملاً اس میں خرد برد کا تصور ناپید ہے۔ اس رقم کا ایک بڑا حصہ ٹی وی اور اخبارات کے اشتہارات کے لیے خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی اخراجات تو ہوتے ہی ہیں۔

صدر اور کانگریس کے اختیارات اور ملکی بجٹ

امریکی جمہوریت میں فیصلہ سازی کا ایک پیچیدہ نظام ہے جس کی اصل روح یہ ہے کہ کوئی بھی فرد یا ادارہ من مانی کی حد

تک طاقت ور نہ ہونے پائے۔ ہر اہم معاملے کے لیے یہ لازم ہے کہ صدر، سینٹ اور ایوان نمائندگان، تینوں اس کی منظوری دے دیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال بجٹ ہے۔ بجٹ مارچ میں سینٹ اور ایوان نمائندگان میں پیش ہوتا ہے۔ پھر بجٹ کے ہر اہم حصے کے متعلق دونوں ایوانوں کی علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں بن جاتی ہے۔ تقریباً ہر سینیٹر یا کانگریس مین کسی نہ کسی کمیٹی کا رکن ہوتا ہے۔ ہر کمیٹی میں بجٹ کے ایک ایک پہلو کی بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ صدر کے نمائندے ہر کمیٹی میں آ کر اپنا کیس پیش کرتے ہیں اور جرح کا جواب دیتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ تقریباً ہر معاملے میں تینوں اداروں میں اتفاق رائے نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ تینوں اداروں کی کمیٹیوں پر مشتمل ایک اور کمیٹی بنتی ہے جو افہام و تفہیم اور کچھ لو اور کچھ دو کے تحت ہر معاملے میں اتفاق رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ عموماً بجٹ کی منظوری کا یہ معاملہ اکتوبر تک یعنی چھ مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اگرچہ اکتوبر بھی اس کے لیے کوئی ڈیڈ لائن نہیں ہے۔ لیکن عموماً نومبر میں مختلف انتخابات ہوتے ہیں جن میں ہر سینیٹر اور کانگریس مین کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے سب لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اکتوبر تک کوئی فیصلہ ہو جائے۔ تاہم اگر فیصلہ نہ ہو سکے تو پرانے بجٹ کی مختص کردہ رقم کے مطابق خرچ جاری رہتا ہے۔

تقریباً تمام معاملات میں یہی طریقہ کار رفرما رہتا ہے۔ البتہ ایمرجنسی کے معاملات میں سینٹ اور ایوان نمائندگان، دونوں ازخود اپنی کارروائی کی رفتار تیز تر کر دیتے ہیں۔ اس سے امریکی نظام میں گفتگو اور مکالمے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کمیٹی سسٹم

دونوں ایوانوں میں کئی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن میں بعض مثلاً ڈیفنس کمیٹی یا خارجہ تعلقات کی کمیٹی بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ان کمیٹیوں کے اجلاس سارا سال جاری رہتے ہیں۔ گویا ہر ممبر اپنے ایوان یا کمیٹی کے اجلاسوں میں سارا سال مصروف ہوتا ہے۔ عموماً یہ اجلاس ہفتے میں چار دن ہوتے ہیں تاکہ ہر ممبر تین دن اپنے حلقے میں گزار سکے۔ اصل فیصلے انھی کمیٹیوں میں ہوتے ہیں۔ پھر انھیں ایوان کے فلور پر لایا جاتا ہے۔

لابئینگ سسٹم

امریکی جمہوری نظام کا ایک دلچسپ پہلو وہاں کا لابی سسٹم ہے۔ امریکہ کے داخلی سیاسی مرکز واشنگٹن میں مختلف لابیٹس (lobbiests) کے سترہ ہزار سے زیادہ دفاتر ہیں، گویا سترہ ہزار سے زیادہ ادارے مختلف ملکوں، انجمنوں، تنظیموں اور افراد کے لیے لابئینگ کر رہے ہیں۔

یہ لابئینگ سسٹم کیا ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کا ہر ادارہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضروریات اور حالات کے مطابق قانون سازی ہو اور اس کے مفادات کے خلاف کوئی قانون سازی نہ ہو (۔ مثلاً ڈاکٹر یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے جس سے ان کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔) چونکہ ان اداروں کے پاس خود وقت نہیں ہوتا، اس لیے یہ لوگ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کسی لابی فرم کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں ۔ یہ فرمیں قانون ساز ادارے میں پیش کردہ بلوں اور قوانین پر نظر رکھتی ہیں، اپنے حق میں مثبت قانون سازی کرتی ہیں، کسی قانون کو ختم کرنا ہو یا کسی زیر تجویز قانون کا راستہ روکنا ہو، یہ فرمیں مختلف سینیٹرز اور کانگریس کے اراکین سے ملاقات کرتی ہیں، انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ انھیں متعلقہ لٹریچر اور دستاویزات فراہم کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بعض اوقات یہ لابیئسٹ فرمیں ایسے ہتھ کنڈوں سے بھی کام لیتی تھیں جنھیں کرپشن کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً یہ مخصوص ارکان کانگریس کو خوبصورت سمندری ساحلوں پر دو تین دن کے لیے لے جا کر ان کے اور ان کے اہل خاندان کے لیے قیام و طعام کا بندوبست کرتی تھیں تاکہ انھیں اپنے موقف سے ''روشناس'' کرایا جا سکے ۔ تاہم تقریباً دس سال پہلے اس ضمن میں کی جانے والی سخت قانون سازی نے اس طرح کے طریقوں کو ختم کر دیا۔

تھنک ٹینک

امریکہ کے اندر ایسے کئی غیر جانب دار یا جانب دار ادارے ہیں جو مختلف اہم مسائل پر ماہرین سے تحقیقاتی رپورٹس مرتب کراتے ہیں، ان کے آپس میں مکالمے اور بحث کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائج فکر کو میڈیا اور عوامی نمائندوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور تحقیقاتی رپورٹس کی صورت میں شائع بھی کراتے ہیں ۔ ان میں ایسے ادارے بھی ہیں جو کسی حکومتی ادارے سے فنڈ نہیں لیتے ۔ بسا اوقات کسی نامور صنعت کار یا تاجر نے اس طرح کے کسی ادارے کے لیے خطیر رقم مختص کی ہوتی ہے، جس کے سود سے یہ ادارہ چلتا ہے ۔ چونکہ یہ ادارے عموماً کسی کے زیر اثر نہیں ہوتے اور انھوں نے تجربہ کار مسلمہ ماہرین کی خدمات حاصل کی ہوتی ہیں، اس لیے ان کی آرا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور عوامی نمائندے کوئی قانون نافذ کرتے یا پالیسی بناتے وقت ان تھنک ٹینکس کے نتائج فکر سے استفادہ لازم سمجھتے ہیں ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امریکہ بحیثیت سپر پاور

آج دنیا میں امریکہ بلاشرکت غیرے عظیم ترین طاقت ہے ۔ دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی ملک اتنا امیر اور اتنا طاقت ور کبھی نہیں بنا تھا جتنا آج امریکہ ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے اندر ایک نئی مساوات نے جنم لیا ۔ اس جنگ سے پہلے برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان بھی سپر طاقت کہلائے جاتے تھے، مگر اس کے بعد ان سب کی حیثیت ثانوی ہو گئی اور اصل اہمیت امریکہ اور روس کی ہو گئی ۔ امریکہ اس لیے سپر پاور بنا کہ اس جنگ میں اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا اور روس اس لیے سپر پاور بنا کہ اس کے پاس بہت بڑا علاقہ، زمین اور وسائل موجود تھے ۔ کاروبار حکومت چلانے کے لیے لاکھوں افراد پر مشتمل کمیونسٹ پارٹی کے جاں بازوں اور مخلص ترین افراد کی ٹیم اور نظریۂ حیات کے طور پر ایک توانا، پرعزم اور کروڑوں

لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور متحد رکھنے والا نظریہ موجود تھا۔ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے بالکل متضاد معاشی نظریے کے حامل ملک تھے، اس لیے دونوں کے درمیان آویزش قدرتی تھی۔ تاہم اس آویزش کو جس چیز نے مہمیز دی وہ روس کی توسیع پسندانہ پالیسی تھی جس کے مطابق اس کی نظریاتی ذمہ داری تھی کہ وہ اس انقلاب کو پوری دنیا میں برپا کرے اور اس کا قائد بنے۔ اس پالیسی نے امریکہ کو یہ جواز فراہم کیا کہ چونکہ روس کے ان ارادوں کی وجہ سے پوری آزاد دنیا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ امریکہ اسے لگام دے اور اس کی بین الاقوامی خواہشات کے مقابلے میں رکاوٹ بنے۔ چنانچہ اگلے چالیس برس یہ مقابلہ جاری رہا جس میں فیصلہ کن فتح امریکہ کو اس وقت حاصل ہوئی جب کمیونسٹ سوویت یونین کے حصے بخرے ہو گئے۔ اس معرکے میں امریکہ کیوں جیتا اور سوویت یونین کیوں ہارا۔ اس کی نظری وجوہات ہم بالواسطہ بیان کریں گے۔ یہ موضوع بذات خود ایک مفصل تحریر کا متقاضی ہے۔ اس لیے اس تحریر میں ہم اس کی عملی تفصیلات سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔

سپر پاورز کی نفسیات

دنیا کی پوری تاریخ میں سپر پاورز کی ہمیشہ سے ایک ہی نفسیات رہی ہے۔ اس کو ایک فقرے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک سپر پاور یہ چاہتی ہے کہ وہ مستقلاً ایک سپر پاور کے طور پر قائم رہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔

اس دنیا میں ہر فرد اور ہر قوم جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ یہ جدوجہد نہ صرف زندہ رہنے کے لیے ہے، بلکہ ایک برتر حیثیت میں زندہ رہنے کے لیے ہے۔ یہاں صرف وہی افراد، نسلیں اور قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو دوسروں سے بڑھ کر جدوجہد کریں۔ چنانچہ اس جدوجہد میں اگر کوئی قوم سب سے برتر مقام تک پہنچے تو یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ وہ اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں اگر اس سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا۔ چنانچہ اس قوم کے لیے ہر وہ فعل بالکل ٹھیک، صحیح، جائز اور مطلوب ہے جس سے وہ اس مقام پر فائز رہے۔

سپر پاور برقرار رہنے اور اس سے محروم ہونے کے عوامل

دنیا کی تاریخ عروج و زوال کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ ماضی کی سپر پاورز کا آج کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی کی سپر پاور آج بھی زندہ ہوتی ہے، لیکن نسبتاً کم تر حالت میں۔ ایسا کن عوامل کی بنا پر ہوتا ہے کہ ایک سپر پاور آہستہ آہستہ یا یک دم اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہے اور اسے دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے؟ اس کے اصلاً چار عوامل ہیں:

۱۔ اجتماعی اخلاقیات

چند ایسی بنیادی اجتماعی صفات ہیں جن کی ایک قوم میں موجودگی اس قوم کے اندرونی اتحاد اور اس کی بقا و نمو کی ضامن

ہوتی ہیں۔ یہ صفات جتنی اعلیٰ ترین شکل میں ہوتی ہیں، وہ قوم عالمی برادری میں اتنے ہی اونچے مقام و مرتبے کی حامل ہوتی ہے اور اگر وہ سپر پاور ہو تو وہ اپنے اس مقام پر فائز رہتی ہے۔ ان میں پہلی صفت اپنے ملک، مذہب یا نظریے سے محبت، اپنے معاشرے کے ساتھ یک جہتی و یکتائی کا احساس اور ایک قومی احساس تفاخر اور بہادری ہے۔ دوسری صفت مساوات انسانی اور جمہوری کلچر ہے جس کی وجہ سے ہر انسان اپنے آپ کو پوری قوم سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہے اور اسے خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے۔ اور پوری قوم کے اندر جوش و جذبہ ہر وقت زندہ ہوتا ہے۔ تیسری صفت امانت و دیانت ہے۔ چوتھی صفت انصاف ہے۔ پانچویں صفت میرٹ ہے یعنی یہ کہ ہر فرد کو قابلیت و صلاحیت کی بنیاد پر جانچا جائے، رشوت و سفارش کم سے کم ہو اور سب کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ہوں۔ چھٹی صفت محنت ہے یعنی یہ کہ سوسائٹی میں محنت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ ساتویں صفت ملکی قانون کی پابندی ہے یعنی یہ کہ کوئی بھی اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھے۔ آٹھویں صفت محروم اور کمزور طبقات کی خدمت کا توانا جذبہ ہے۔ نویں صفت تدبر، حکمت و دانش اور سوسائٹی میں مکالمے کا دور دورہ ہے۔ اور دسویں صفت قوم میں بلحاظ مجموعی صبر و استقامت کے جذبے کی موجودگی ہے۔

یہ سب خوبیاں باہم دگر مربوط ہیں یعنی ایک کی کمی سے خود دوسری میں بھی انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان صفات میں بھی سب سے اہم جمہوری کلچر ہے جس کے فقدان سے قومی محبت، انصاف، میرٹ اور کئی مزید پہلوؤں میں بھی کمزوری اور زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کا زوال بھی جمہوریت کے فقدان کی وجہ سے ہوتا تھا۔ وہ یوں کہ سوسائٹی کے اندر ابتدا میں ایک خاص وقت تک تو نئے علاقوں پر فتح کے نتیجے میں ملنے والی دولت کی وجہ سے جوش و جذبہ موجود رہتا تھا۔ مگر جمہوری کلچر کے فقدان کی وجہ سے ایک طرف حکمرانوں کا احتساب ممکن نہیں ہوتا تھا، موروثی نظام کی وجہ سے انھیں اقتدار سے بے دخلی کا ڈر نہیں رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی کی لذتوں، آسانیوں اور رنگینیوں کی کشش میں مبتلا ہو جاتے تھے، دوسری طرف عوام کی امور مملکت سے لاتعلقی کے نتیجے میں ان کی اپنے ملک سے محبت، جذبۂ قربانی اور ملکی قانون کی پابندی میں کمی آنے لگتی تھی۔ نتیجہ کسی اور طاقت کے غلبے یا ظہور کی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔

زمانۂ قریب میں کمیونسٹ روس کا خاتمہ بھی جمہوریت کے فقدان سے ہوا۔ شروع میں کمیونزم کے نظریاتی جذبے اور کشش کی وجہ سے ملک ترقی کرتا رہا۔ مگر بعد میں جب کمیونسٹ پارٹی کی ایک اعلیٰ ترین کلاس کے ہاتھ میں سارا اختیار مرتکز ہو گیا، احتساب ختم ہو گیا، میرٹ کی جگہ رشوت نے لے لی، بالادست طبقے سے امانت و دیانت ختم ہو کر رہ گئی تو عوام نے محنت چھوڑ دی۔ ان کی اپنے ملک سے محبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ سوسائٹی پوری طرح کرپٹ ہو کر رہ گئی۔ نتیجتاً وہ اندر سے اتنی کھوکھلی ہو گئی کہ وہ افغانستان کے چھوٹے سے دھچکے سے بھی سنبھل نہ سکی۔ اگر اس وقت افغانستان کے مسئلے کے بجائے کوئی بھی اور مسئلہ سوویت یونین کے لیے پیدا ہو جاتا تو یہی نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ اگر افغانستان میں روسی مداخلت کا موازنہ ویت نام میں امریکی مداخلت سے کیا جائے تو ویت نام میں امریکی جانی و مالی نقصان روس کے افغانستان میں نقصان سے کئی گنا زیادہ

تھا۔اس کے باوجود امریکہ پر ویت نام کی لڑائی کا کوئی بڑا اثر مرتب نہیں ہوا۔

جمہوریت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی جمہوری ملک کچھ اور عوامل کے نتیجے میں سپر پاور کے درجے سے گر جائے ،تب بھی وہ مکمل طور پر زوال آشنا نہیں ہو جاتا ، بلکہ وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے ۔مثلاً دوسری جنگ عظیم میں جرمنی، جاپان اور اٹلی ایک عظیم نقصان اور شکست سے دوچار ہو گئے ۔دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کا نقصان بھی کچھ کم نہ تھا۔لیکن یہ تمام آج بھی بہت بڑی طاقتیں ہیں ۔ان میں سے ہر ایک ملک کی علیحدہ علیحدہ مجموعی قومی پیداوار تمام عالم اسلام کی مجموعی پیداوار سے زیادہ ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

سپر پاور بننے اور برقرار رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر اعلیٰ ترین دسترس حاصل کی جائے اور اس معیار کو نمو و ترقی کے ذریعے سے برقرار رکھا جائے ۔یہ ترقی صنعتی ،زرعی ،طبعی ،دفاعی ،جنگی غرض یہ کہ ہر میدان میں ہونی چاہیے۔گویا جدید ترین علم کا مسلسل حصول اور اس کا استعمال و اطلاق ایک سپر پاور کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ظاہر ہے کہ اس غرض کے لیے تعلیم ،ریسرچ ،دریافت اور اس سے متعلقہ تمام پہلوؤں کی طرف آخری درجے میں بھرپور توجہ ضروری ہے۔چنانچہ سپر پاورز یہ سب کام کرتی ہیں اور یہ ان کے لیے اہم ترین شعبوں میں سے ایک ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ٹیکنالوجی کی برتری کی وجہ سے انگریزوں ،فرانسیسیوں ،پرتگیزوں اور ولندیزوں نے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں مسلم دنیا سمیت افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے علاقوں پر قبضہ جما لیا جو انیسویں صدی کے نصف تک جاری رہا۔اسی فرق کی وجہ سے ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ شکست کھا گئے ۔بہتر ٹیکنالوجی اور تنظیم ہی کی وجہ سے سید احمد شہید کے مقابلے میں سکھ غالب رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کے مقابلے میں انگریز کامیاب رہے۔

ٹیکنالوجی ہی کی مدد سے امریکہ نے روس کو افغانستان میں ۱۹۸۵ء میں شکست دی جب اسٹنگر میزائلوں نے روسی ہیلی کاپٹروں پر ۹۰ فی صد ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر ان کی فضائی برتری ختم کر دی۔اسی وجہ سے برطانیہ نے ارجنٹائن کے بالکل پاس جا کر فاک لینڈ کی جنگ میں اسے شکست سے دوچار کیا۔یہ ٹیکنالوجی ہی کا کرشمہ تھا کہ امریکہ نے اپنے کسی خاص جانی نقصان کے بغیر طالبان کو شکست سے دوچار کیا۔

یہاں ایک سوال کا جواب مناسب معلوم ہوتا ہے ۔وہ یہ کہ مسلمانوں کے دور زوال کی تاریخ غداروں سے کیوں بھری ہے؟ کہا جاتا ہے کہ میر جعفر کی غداری سے سراج الدولہ اور میر صادق کی غداری سے ٹیپو سلطان شکست کھا گئے ۔۱۸۵۷ء کی شکست بھی اپنوں کی غداری ہی کا نتیجہ تھی اور سید احمد بھی چند خوانین کی غداری کی وجہ سے بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے ۔یہ دراصل سطحی تاریخی اور عمرانی مطالعے کا نتیجہ ہے ۔دراصل غدار ہمیشہ اس جگہ جنم لیتے ہیں جب ایک طرف کی فوج ٹیکنالوجی اور معروضی حالات کی وجہ سے واضح برتر پوزیشن میں ہو اور دوسری طرف کے کچھ ذمہ دار لوگوں کی اپنے تجزیے کی

وجہ سے شکست سامنے نظر آ رہی ہو تو وہ اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے دشمن سے اپنا معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام لڑائیوں میں انگریزوں کے ہاں کسی غدار نے جنم نہیں لیا۔ اس قابل شرم مخلوق نے ہمیشہ ہماری طرف ہی سے جنم لیا ہے۔

گویا جو بھی طاقت اپنے آپ کو برتری کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتی ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو۔

قدرتی عوامل اور ارتقائے زمانہ

کئی قدرتی عوامل اور زمانے کی ترقی بھی مختلف طاقتوں کی برتری و کمزوری میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ جس ملک کی آبادی زیادہ ہو، رقبہ بڑا ہو اور وہ قدرتی وسائل پر دسترس رکھتا ہو، اتنا ہی اس کے سپر پاور بننے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس مقام پر نہ رہے تب بھی وہ کامل زوال اور فنا سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح زمانے کی ترقی سے ایسے نئے عوامل پیدا ہوتے ہیں جن سے معروضی حالات میں جوہری فرق رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً چین کے ایک بڑی طاقت بننے میں اس کی آبادی اور رقبے کا بڑا دخل ہے۔ امریکہ کا معاملہ بھی ایسا ہے۔ اسی طرح سویت یونین دنیا کے نقشے سے مٹ گیا، مگر روس پھر ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگلے پانچ دس سال میں اس کی عظمت رفتہ کسی حد تک پھر بحال ہو جائے۔

اسی طرح جب جمہوریت دنیا کے اندر ایک مسلمہ قدر بن گئی تو مغربی ممالک کے اندر یہ عوامی شعور ابھرا کہ دوسری قوموں کو غلام بنانا غلط ہے۔ دوسری طرف ان غلام قوموں کے اندر بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر جمہوریت مغرب کے لیے اچھی ہے تو وہ ہمارے لیے کیوں بری ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ ممالک آزاد ہو گئے۔

مغرب کے اندر یہ اقدار اب مسلمہ حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ اب وہاں کی حکومتیں دوسرے ممالک سے معاملات کرتے وقت بظاہر ان کی خلاف ورزی نہیں کرتیں، اس لیے کہ ان کو اپنے ہاں کے عوامی ردعمل کا ڈر ہوتا ہے۔ گویا اگر کوئی عام ملک مغربی ممالک کی دست برد سے محفوظ رہنا چاہے تو خود انھی کی اقدار سے فائدہ اٹھا کر ایسا کر سکتا ہے۔ اب یہ بھی مغرب کی مجبوری بن گئی ہے کہ کسی بھی دشمن پر حملے سے پہلے اس کے لیے اپنی رائے عامہ کو مطمئن کرنا، بلکہ بسا اوقات دنیا کے ایک بڑے حصے کو مطمئن کرنا، بلکہ عملاً اپنے ساتھ ملانا لازم بن جاتا ہے۔

اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے ترقی پزیر دنیا کے سامنے ٹیکنالوجی کے حصول کے آسان ترین راستے کھول دیے ہیں۔ اب سائنس اور ٹیکنالوجی پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی۔ ہر ملک عزم صمیم اور پیہم محنت کے ذریعے سے کم سے کم وقت میں سائنس کی اعلیٰ ترین رفعتوں کو پا سکتا ہے۔ گویا ٹیکنالوجی کے حصول میں وقت کا فرق (time gap) ختم ہو گیا ہے اور غیر ترقی یافتہ ممالک بہت کم عرصے میں مغرب کے برابر ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر کے اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔

ایسے ہی عوامل کی وجہ سے قدرت کمزور قوموں کو زندہ رہنے اور آگے بڑھنے اور مضبوط ملکوں کو مضبوط تر بننے کے مواقع دیتی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رہتی ہے۔اب کوئی تو ان مواقع سے فائدہ اٹھالیتا ہےاور کوئی اپنے آپ کومحروم رکھ لیتا ہے۔

صحیح حکمت عملی

سپر پاور بننے، رہنے اور اپنے آپ کوحال اور مستقبل کی مشکلات سے بچانے کی خاطر عالمی حالات کا صحیح تجزیہ اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی حد درجہ ضروری ہے۔ یہ حکمت عملی زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ، دونوں میں ہوتی ہے۔اس مقصد کے لیے جاسوسی کا ایک وسیع نیٹ ورک تشکیل دیا جاتا ہے۔مخالف قوت کے خلاف چالیں چلی جاتی ہیں اور اس کی چالوں کو ناکام بنایا جاتا ہے۔ یہاں اس ضمن میں اصل اہمیت کسی اخلاقی اصول کی نہیں، بلکہ اپنے ملک کی کامیابی کی ہوتی ہے۔مثلاً اپنے ملک میں رشوت دینے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا،مگر باہر کے مخالفین کوخریدنے کے لیے رقم کا استعمال بے تکلف کرلیا جاتا ہے۔گویا سپر پاور کے لیے دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے کے ضمن میں سب سے بڑا اصول دراصل ہر اس ممکن طریق عمل سے کام لینا ہے جس سے وہ سپر پاور کے منصب پر سرفراز رہے یا اگر مجبوری آڑے آجائے تو وہ ایک خاص سطح سے گرنے نہ پائے۔ جمہوری ممالک میں تمام غیر سرکاری ادارے بھی ہر اہم اور بحرانی موقع پر اپنے ملک کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔مثلاً سرد جنگ کے زمانے میں سارا مغربی میڈیا کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے میں اپنی حکومتوں کا ہم نوا تھا۔افغانستان میں روسی فوجی مداخلت کے بعد آزاد مغربی میڈیا پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے لیے پوری طرح رطب اللسان تھا اور انھیں اس ملک میں جمہوریت کی یاد قطعاً نہ ستائی۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکی ٹی وی اور پریس میں کوئی مخالفانہ رائے دینا ناممکن حد تک مشکل تھا۔گویا جس ''قومی مفاد'' پر ''اجماع'' ہوجائے، وہاں قومی مفاد ہی اعلیٰ ترین اصول بن جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

ہر جنگ اور ہر معرکے میں اسی ملک کو کامیابی ملی ہے جس نے بہتر حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔اگر جرمنی جذباتیت سے کام لے کر پہلی اور دوسری جنگ عظیم نہ چھیڑتا تو آج وہ سپر پاور ہوتا۔یہی صورت حال جاپان کی ہے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ نے دیکھا کہ اس کی آبادی تھوڑی ہے اور اب اس کے لیے اپنی نوآبادیات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہے تو اس نے آہستہ آہستہ تمام غلام ملکوں کو آزاد کر کے اپنی قوت محفوظ کرلی۔ ہمارے ہاں بعض کم فہم سیاسی نعرے بازی کے طور پر کہتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ پر پہلے سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اب اس پر سورج طلوع بھی نہیں ہوتا۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سورج نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے طلوع ہوتا ہے جو سلطنت برطانیہ ہی کی ایک توسیع ہے اور پھر وہ بحر ہند کے انگریزی عمل داری والے مختلف جزیروں سے ہوتا ہوا جنوبی افریقہ جا پہنچتا ہے۔ یہاں سورج یورپ سے ہوتا ہوا امریکہ جا پہنچتا ہے جو برطانیہ ہی کی اولاد ہے اور وہاں سے ہوتا ہوا وہ بحرالکاہل کے ان جزیروں پر جا چمکتا ہے جہاں امریکی پرچم لہراتا ہے۔

چین نے بھی خارجہ حکمت عملی کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔تائیوان اسی کا جزو ہے جو امریکی پشت پناہی سے آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ ہے، مگر چین نے آج تک اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں کی، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے وہ مشکلات میں پھنس جائے گا۔اسی طرح ایک لمبے عرصے سے اس نے یہ پالیسی بنائی ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی

معاملے میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اس نے پاکستان کی کوئی فوجی مدد نہیں کی، حالانکہ اس کی عملی مداخلت کی صرف دھمکی ہی بنگلہ دیش بننے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں سیاچین پر بھارتی قبضے کے وقت بھی اس نے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ ۱۹۹۹ء میں پاکستان نے کارگل کے محاذ پر جو لڑائی شروع کی، اس پر بھی چین نے ناراضی کا اظہار کیا اور پاکستان کی عملی مدد سے انکار کیا۔ دراصل چین کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک بھرپور عالمی طاقت بننے تک وہ امریکہ سے کسی بھی طرح بگاڑ پیدا نہ کرے تاکہ امریکہ کو اس کے خلاف کارروائی کا کوئی جواز نہ مل سکے۔

اسی طرح جب چین نے دیکھا کہ کمیونزم اس کی معاشی ترقی میں رکاوٹ بن رہا ہے تو اس نے بہت عرصہ پہلے بڑے شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام کو پھلنے پھولنے کی آزادی دی۔ اسی لیے جب روس اور باقی کمیونسٹ دنیا میں بغاوت کی لہر پورے زوروں پر تھی، چین اس سے نسبتاً محفوظ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار پر سے تو اپنی گرفت کمزور نہیں کی، لیکن عوام کو مزید معاشی آزادی دے کر اس نے اپنے ہاں بغاوت پر قابو پا لیا۔ اور اب نومبر ۲۰۰۲ میں بوڑھی قیادت نے نئی قیادت کے لیے جگہ چھوڑ کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔

سپر پاورز دنیا میں اپنی سودے بازی کی قوت برقرار رکھنے کی خاطر اپنے سخت ترین مخالف ملکوں کو بھی قرضے اور امداد دیتی ہیں۔ مثلاً امریکہ غیر ترقی یافتہ دنیا کے تمام ممالک کو امداد دیتا ہے جس میں اس کے بدترین مخالف بھی شامل ہیں۔ اس سے امریکہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رابطے کا دروازہ کھلا رہے اور مناسب موقع پر اسے استعمال کیا جائے۔ سپر پاورز اپنی غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ اپنی پوری تاریخ میں امریکہ سے ایک ہی بڑی غلطی ہوئی ہے اور وہ ہے ویت نام میں فوجی مداخلت۔ اس کے مقابلے میں امریکہ نے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں، تاہم امریکہ میں ان کامیابیوں کو بہت کم یاد رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس واشنگٹن کی اہم ترین یادگاروں میں سے ایک ویت نام جنگ کی یادگار ہے۔ اس عجیب وغریب یادگار، جس پر ان تمام اڑسٹھ ہزار ہلاک شدگان کے نام بمعہ کمپنی و رجمنٹ کندہ ہیں جو اس جنگ میں کام آئے، روزانہ سیکڑوں افراد آتے ہیں اور میموریل ڈے پر تو وہاں ہزاروں افراد کے میلے کا سماں رہتا ہے۔ یہ عام انسانی نفسیات ہے کہ لوگ اپنی ناکامیاں فراموش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جیسے ہم نے بحیثیت قوم سقوط مشرقی پاکستان کی یاد کبھی نہیں منائی اور چھ ستمبر کی چھٹی ہمیشہ کرتے ہیں۔ اسی طرح پچھلے ایک برس کے دوران میں طالبان کی حامی قوتوں نے طالبان کی شکست کا کوئی سنجیدہ تجزیہ نہیں کیا، بلکہ ان کی تقریروں سے طالبان کا نام ہی غائب ہو گیا ہے۔ لیکن زندہ قومیں اپنی کامیابیوں کے بجائے ناکامیوں کو ایک زندہ واقعے کے طور پر یاد رکھتی ہیں اور ہر ہر حوالے اور پہلو سے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ آیندہ اس کے اعادے سے بچا جا سکے۔

یہ بات واضح ہے کہ سپر پاورز خارجہ تعلقات اور اقدامات کے ضمن میں خفیہ اور کبھی کبھار علانیہ طور پر دہرے معیار سے کام لیتی ہیں، تاہم وہ بظاہر اور بعض اوقات مجبوراً بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرتی ہیں۔ جمہوری ممالک کے خلاف قدم اٹھانا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے اور اب اپنی رائے عامہ کو مطمئن کرنا، اپنے اقدامات انسانی امن اور انسانیت کے مفاد کے لیے ثابت کرنا اور اقوام عالم کی اکثریت کو کسی بھی طریقے سے مطمئن کرنا، ان کے لیے کسی بھی بڑی مہم سے پہلے لازم بن گیا ہے۔ یہ سب کچھ حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر کیا جاتا ہے۔

امریکہ بحیثیت سپر پاور برقرار رہنے کے تقاضے

درجہ بالا بحث سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ امریکہ سپر پاور برقرار رہنے کے تمام تقاضے بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے تمام بین الاقوامی تنازعات میں سرگرم شمولیت اور وابستگی سے اپنے آپ کو اقوام عالم کے لیے ناگزیر بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے لیے ضروری خام مال کی فراہمی کا سامان بھی کر لیا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے تمام ممالک اس کے اشارۂ ابرو کے محتاج ہیں۔ اس کے اپنے تیل کے ذخیرے محفوظ ہیں اور اگلے پندرہ بیس برس کے اندر ایسی ٹیکنالوجی بالکل عام ہو جائے گی جب تیل کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ گویا اگلی ربع صدی سے لے کے تیس چالیس برس کے اندر تیل پیدا کرنے والے ممالک کا موجودہ سنہرا دور ختم ہو جائے گا۔

کیا امریکہ سپر پاور کے مرتبے سے گر سکتا ہے

اگر امریکہ کے اندر اجتماعی اخلاقیات میں کمزوری آجائے، جمہوری اقدار ماند پڑ جائیں، انصاف کی حکمرانی نہ رہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی دوسرا ملک اس سے آگے بڑھ جائے، اگر اس سے بین الاقوامی تنازعات میں کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور اگر وہ یہ بھول جائے کہ اسے سپر پاور برقرار رہنے کے لیے ہر وقت بہترین حکمت عملی پر کاربند رہنا ہے تو یقیناً وہ اس مقام کا مستحق نہیں رہے گا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خیال و خامہ

—— جاوید

O

یہ زمانہ بھی کوئی دن تو مرے نام کرے اب کسی اور کا رخ تلخی ایام کرے

جی میں آتا ہے کبھی پیر فلک سے کہہ دوں آخری وقت ہے، وہ جائے اب آرام کرے

آرزو ہے کہ ترا فیض ہوا ہے جس پر پھر ترا فیض زمانے میں وہی عام کرے

آپ دیتا ہے وہی آپ خریدار بھی ہے کوئی بازار میں آئے تو ذرا دام کرے

صبح خنداں پہ ہے، لاریب مسلماں کا بھی حق ہاں، مگر اِس کا تقاضا نہ سر شام کرے

جلوۂ حسن زمیں ہے تو فلک نغمہ سرا

ساقیا، اب تو کبھی رقص ترا جام کرے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org